اصول فقہ اسلامی — علم و تحقیق کا منہج

مصنف

ڈاکٹر طہ جابر علوانی

مترجم

مولانا عتیق احمد بستوی

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ
(کتاب میں پیش کئے گئے خیالات کا ناشر کی رائے سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے، کوئی تیسرا شخص کتاب کو ویب سائٹ یا کسی اور ذریعے سے عام کرتا ہے تو اس کے مصدر اصلی کے مطابق ہونے کی ذمہ داری ناشر کی نہیں ہے)

نام کتاب : اصول فقہ اسلامی۔علم وتحقیق کا منہج

Usool-e-Fiqh-e-Islami Ilm wa Tahqeeq ka Manhaj

عربی نام: (أصول الفقه الإسلامی۔منهج بحث ومعرفة)

مرتب: ڈاکٹر طہ جابر علوانی

مترجم: مولانا عتیق احمد بستوی

نظر ثانی: ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی

صفحات: ۸۸

سن اشاعت: ۲۰۲۵ء

تعداد: ۳۰۰۰

طبع: دوم

ISBN : 978-81-995727-9-9

باهتمام : اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

ناشر

ایف پبلیکیشنز-نئی دہلی

۱۶۱-ایف، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل :ifapublications2004@gmail.com

فون :011 - 26981779


بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

پیش لفظ	۷
مقدمہ برائے طبع دوم	۹
پہلی فصل	۱۳
دوسری فصل	۲۳
تیسری فصل	۳۵
چوتھی فصل	۴۴
پانچویں فصل	۵۷
چھٹی فصل	۷۲
حواشی	۸۳

پیش لفظ

یہ مقالہ دراصل اصول فقہ سے متعلق ان مطالعات کا ایک جز ہے جو ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۳ء میں جامعہ ازہر سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھے گئے میرے مقالے میں شامل ہے، اور پھر ''اسلامیۃ المعرفۃ'' (Islamization of Knowlage) سے متعلق فکر اسلامی کی دوسری عالمی کانفرنس میں مقالہ پیش کرنے کے لئے اس میں مناسب ترمیمات/تبدیلیاں کی گئیں، یہ کانفرنس سن ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء میں اسلام آباد پاکستان میں منعقد ہوئی تھی۔

جب ''رابطۃ الشباب المسلم العربی'' کے لوگوں نے اصول فقہ کے موضوع پر تعلیمی سیشن کا پروگرام بنایا تو اس مقالہ کے عناصر بھی ان چھ موضوعات میں شامل تھے جن پر اس پروگرام میں بحث ہوئی۔

اس تعلیمی سیشن میں حصہ لینے والے بہت سے حضرات نے خواہش ظاہر کی کہ یہ محاضرات (لکچرس) انھیں لکھی ہوئی شکل میں مل جائیں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ یہ مقالہ ''اسلامیۃ المعرفۃ'' سے متعلق جسے المعہد العالمی للفکر الاسلامی جلد ہی جاری کرنے والا ہے، اس سے متعلق اسلام آباد کی کانفرنس میں پیش کردہ دوسرے مقالات کے ساتھ پریس میں موجود ہے، میں نے سوچا کہ اس مقالہ کی کچھ کاپیاں ان بھائیوں کی خدمت میں جنھوں نے اس تعلیمی سیشن میں حصہ لیا، پیش کردوں، اسی طرح ان لوگوں کے لئے پیش کردوں جو علوم شرعیہ کے اس اہم اصولی علم سے واقف ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، جسے بجا طور پر بحث وتحقیق کا وہ اہم منہج سمجھا جاتا ہے جو خالص مسلم دماغ کی ایجاد ہے، لہذا یہ علم اسلامی علم کا بنیادی ستون ہے، جس کا نفع صرف اسلامی تہذیب وثقافت تک محدود نہیں ہے بلکہ عالمی تہذیب وثقافت نے اس سے

فائدہ اٹھایا ہے؛ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس علم کے بیشتر امور و مسائل ان بنیادی مسائل میں سے ہیں جن پر بحث و تحقیق کے عمومی مناہج اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی صرف ایک ہی مثال کافی ہے کہ قیاس شرعی ہی کو بحث و تحقیق کے تجرباتی منہج کی اصل فکری بنیاد قرار دیا جاتا ہے اور تجرباتی منہج ہی عہد حاضر کی تہذیب و ثقافت کی خشتِ اول (پہلی اینٹ) ہے۔

اصول فقہ کا یہ تجزیہ اور جائزہ ہم ان تمام لوگوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جنھیں اس علم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق ہے اور اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ لوگوں کو ہمارے علم سے فائدہ پہنچائے اور ہمیں علم نافع سکھائے اور ہمیں غیر نافع علم اور غیر مقبول عمل سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اللہ تعالی ہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

ڈاکٹر طہ جابر علوانی

مقدمہ برائے طبع دوم

اب، مجھے اس مختصر، معمولی رسالہ کا دوسرا ایڈیشن پیش کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے جس کو تیار کرنے میں کئی سال لگے، اس ایڈیشن میں مزید اصلاح و تنقیح کی گئی ہے، حالانکہ اس میں کوئی اضافہ یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

جس وقت یہ رسالہ تیار کیا گیا اس وقت میرے ذہن میں ایک ضخیم رسالہ یا کئی تحقیقات و مطالعات کا مقدمہ پیش کرنا تھا جو منہج کے موجودہ بحران یا مشکل کو حل کرے، یا تحقیق کے بگڑے ہوئے طریقوں کے متبادل کوئی ایسا منہج پیش کرے جس میں اسلامی فکری مہارت اور اسلامی وراثت کو مناسب طریقے سے استعمال کیا جائے، خاص طور پر چونکہ اصول فقہ علم و تحقیق کا منہج سمجھے جانے کی وجہ سے فقہی ظاہرہ کے ساتھ خاص ہے، خواہ وہ کسی بھی صورت میں انسانی ہو یا سماجی، لیکن اس میں ایک خاصیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بحث کے دائرہ میں یہ ظاہرہ ادلہ شرعیہ تفصیلیہ سے ماخوذ اپنے کسی فقہی حکم سے حاصل ہوتا ہے، لہذا یہ ایک ایسا استنباطی منہج ہے جو بعض وسطی مناہج پر انحصار کرتا ہے، جیسے کہ لغوی منہج، اور کسی شکل میں تاریخی منہج، اور یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

''فقہی ظاہرہ'' خواہ خاص ہو یا عام، اور ''سماجی ظاہرہ'' کے درمیان فرق مخفی نہیں ہے، اس کے باوجود ''اصول فقہ'' کا مطالعہ اور اس کے مختلف پہلوؤں اور اس کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کرنا سماجی ظاہرہ کے مطالعہ کے مناہج کے لئے بہت مفید ہے، اور دونوں کے درمیان تعلق کو ظاہر کرنا بہت مفید اور اہمیت کا حامل ہے۔

بلاشبہ سماجی مظاہر کو حل کرنے والے سماجی علوم کی نشو ونما ہوئی، پھر ان میں نکھار پیدا ہوا، پھر ان کی نئی درجہ بندی کی گئی، جن کو ایک سو پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوئے، ان میں

سے بعض تو چند دہائی پہلے واضح ہو کر سامنے آئے، مثال کے طور پر علم النفس اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ فلسفہ سے جڑ کر ایک علم کی حیثیت سے ابھی تقریباً سو سال پہلے ظاہر ہوا۔ اسی طرح سماجیات بھی ہے جس کا آغاز "Dur Chain" کے ہاتھوں ہوا، یا "Anthropology" کے علم کی نشو ونما بھی ہوئی، پلا بڑھا اور انیسویں صدی کے وسط میں علوم فلسفہ سے الگ ہو گیا، یہ علوم مختلف امتیازی شکلیں اختیار کرنے لگیں، جن میں سے بعض علوم بعد کے زمانہ میں بعض کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

جہاں تک اصول فقہ کا تعلق ہے تو یہ ان علوم میں سے ہے جنھیں مسلمانوں کے ذہن نے شروع کیا، اور کسی دوسری قوم سے منتقل نہیں کیا گیا، یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے تن تنہا تین علوم تخلیق کئے ہیں:

پہلا علم: علم اصول فقہ

دوسرا علم: علم مصطلحات حدیث

تیسرا علم: علم عروض جو شعر کے اوزان کو منضبط کرتا ہے۔

یہ علوم خالص اسلامی علوم ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ذہن اس سے پہلے کی قدیم اقوام کے علماء سے متاثر نہیں تھا۔ لہذا اصول فقہ اور سماجی مظاہر کے مطالعہ کے درمیان، یا اس کے اور سماجی علوم کے درمیان تعلق کا موضوع ایک ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں بعض مسلم اسکالرز کے ذریعہ اسلامی متبادل تلاش کرنے کی کوششوں کے تناظر میں بہت بعد میں چند چیزیں لکھی گئیں اور چند امتیازی کام کئے گئے۔ خاص طور پر ان علوم ومناہج کے تناظر میں جو بڑے اشکالات سے دو چار ہیں، جن کے بارے میں علماء اور ماہرین طویل عرصے سے ان پر تحقیق کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں نہ کہ ان اشکالات کا حل پیش کرنے کا۔

تاہم اس رسالہ کے مصنف کا خیال ہے کہ ''قرآن کے علمی منہج'' کے رجحانات سے متاثر کن باشعور اسلامی مطالعہ کے ساتھ ''اصول فقہ'' ''اشکالیۃ المنہج'' کو حل کرنے کے لئے اہم

اشارے فراہم کرسکتا ہے۔ اس رسالہ کے اضافی اقساط کے طور پر ایک یا ایک سے زیادہ رسالے تیار کرنے کا ارادہ تھا، لیکن بعض رکاوٹوں اور دوسرے کاموں کے پیش آجانے کی وجہ سے میں اب تک یہ نہیں کرسکا، لیکن مجھے پوری امید ہے کہ آنے والے عرصے میں اس سے متعلق ایک دراسہ تیار کرسکوں گا جو اس مقدمہ کا تکملہ ہوگا اور اس میں معاون ہوگا۔

ہم اس کی تکمیل وتحقیق کے لئے اللہ سے مدد، استحکام اور توفیق کی دعا کرتے ہیں، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

ڈاکٹر طہ جابر علوانی

ہرنڈن، ورجینیا

رجب الخیر ۱۴۱۵ھ

جنوری ۱۹۹۵ء

☆ ☆ ☆

پہلی فصل

۱۔علم اصول فقہ کی تعریف:

علماء نے علم اصول فقہ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ اصول فقہ اجمالی طور پر فقہ کے طرق (ذرائع و مآخذ)، ان طرق سے استدلال کی نوعیت اور استدلال میں پیش کردہ دلائل کی کیفیت کے مجموعے کا نام ہے(۱)۔

۲۔علم اصول فقہ کا موضوع:

اس علم کا موضوع شریعت کے سماعی دلائل ہیں اس اعتبار سے کہ دلائل میں تعارض کی صورت میں کسی ایک کو ترجیح دینے کے بعد اجتہاد کی راہ سے ان دلائل سے احکام شرعیہ تمام جزئیات کے ساتھ ثابت کئے جاسکیں(۲)۔

۳۔علم اصول فقہ کا فائدہ:

جن لوگوں میں اجتہاد کی اہلیت ہے اور ان میں شرائط اجتہاد مکمل طور پر پائی جاتی ہیں ان کے لئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ ادلہ شرعیہ سے احکام شرعیہ جاننے کی قدرت پیدا ہوجائے گی، اور جن لوگوں میں اہلیت اجتہاد نہیں ہے انھیں اس علم کا فائدہ یہ ہوگا کہ مجتہدین کے مذاہب اور ان کے مستنبط کردہ احکام کے دلائل کی معرفت حاصل ہوگی بایں طور کہ اصولی کے اندر مختلف مذاہب کے مطالعہ اور تحلیل وتجزیہ کا ملکہ پیدا ہوگا، اور کسی ایک مذہب کو ترجیح دینے اور اختیار کرنے اور ائمہ مجتہدین کے اصول وقواعد پر تخریج مسائل کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

۴۔ وہ علوم جن سے اس علم کے مسائل ماخوذ ہیں:

علم اصول فقہ درحقیقت ایک مستقل بالذات علم ہے، لیکن اس کے کچھ مقدمات ہیں جن سے اصولی بے نیاز نہیں ہوسکتا، اور وہ بہت سے علوم سے ماخوذ ہیں:

الف۔ اصول فقہ کے بعض مقدمات ارسطو کے اس علم منطق سے ماخوذ ہیں جس کے متکلمین میں سے اصول پر لکھنے والے عادی ہیں کہ وہ اپنی تحریروں میں یہ مقدمات لائیں، مثلاً دلالات لفظیہ اور اس کے اقسام کے مباحث، لفظ کا تصور وتصدیق میں منقسم ہونا، تصورات کے مبادی یعنی تشریحی اقوال اور تعریفات پر کلام کی ضرورت، اور حدود ورسوم میں ان کا منقسم ہونا، تصدیقات کے مبادی، برہان پر بحث کہ برہان کو اپنے دعوی کے اثبات اور مخالف کے دعوی کی تردید میں کس طرح استعمال کیا جائے، اور اس طرح کی دوسری بحثیں۔

ب۔ ان میں سے بعض مقدمات انہوں نے علم کلام سے حاصل کئے مثلاً ان کی یہ بحث کہ حکم لگانے والی شریعت ہے یا عقل؟ اسی سے ملحق یہ بحث کہ شریعت سے قبل اشیاء کا حکم کیا ہوگا؟ منعم کا شکر ادا کرنا شریعت سے واجب ہے یا عقل سے؟

ج۔ بعض مقدمات لغات کے کلی احکام سے متعلق ہیں جنھیں اہل اصول نے نکھارا ہے، اور جنھیں لغوی مباحث سے انھوں نے حاصل کیا ہے، مثلاً لغات اور وضع لغات سے متعلق بحثیں، حقیقت ومجاز میں الفاظ کا منقسم ہونا، اشتراک، اشتقاق، ترادف، تاکید، عموم، خصوص، معانی حروف وغیرہ سے متعلق بحث۔

د۔ بعض مقدمات قرآن وسنت کے علوم سے مستفاد ہیں جیسا کہ بہت سے مباحث قرآن وسنت کے درمیان مشترک ہیں، مثلاً متواتر اور خبر واحد کی بحث، قرأت شاذہ اور اس کے حکم کا بیان، جرح وتعدیل، ناسخ ومنسوخ، اور احوال متنِ حدیث اور احوال سند حدیث پر بحثیں۔

ہ۔ اسی طرح اہل اصول جو مثالیں پیش کرتے ہیں وہ کتاب وسنت سے مستنبط تفصیلی ادلہ یا فقہی فروعات سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

۵۔ وہ مباحث جن سے اصولیین عام طور پر بحث کرتے ہیں (۳):

الف: منطقی مقدمات

ب: مباحث لغات

ج: اوامر ونواہی

د: عموم وخصوص

ہ: مجمل ومبین

و: نسخ

ز: افعال (رسول اللہ ﷺ کے افعال اوران کی دلالتیں)

ح: اجماع

ط: اخبار (سنت رسول)

ی: قیاس

ک: تعارض وترجیح

ل: اجتہادوتقلید

م: مختلف فیہ ادلہ۔

۶۔ علم اصول فقہ کا آغاز اوراس کے ارتقاء کی تاریخ:

علم اصول فقہ کی تاریخ اورنشو ونما کا مطالعہ ''فقہ'' کی تاریخ سے دور رہ کر بہت دشوار ہے، ''فقہ'' نام ہے ان عملی شرعی احکام کا جو شریعت کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ حاصل کئے جائیں۔

''اصل'' وہ ہے جس پر دوسرے کی بنیاد رکھی جائے، اور ''فقہ'' اپنے ان اصولوں پر مبنی ہے جو فقہ کے ادلہ ہیں اور جن سے فقہ اسلامی کا چشمہ پھوٹا ہے؛ اس لئے اصول فقہ کی تاریخ سے متعلق ایک اجمالی نظریہ کی تشکیل ضروری ہے۔

بلاشبہ قانون سازی، احکام کا ثابت کرنا، قواعد وقوانین کو وجود میں لانا، اور نظاموں کا وضع کرنا ایسی حاکمیت ہے جو اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہے، اللہ نے حاکمیت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، لہذا ان میں سے کسی چیز کی نسبت غیر اللہ کی طرف کرنا اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے جو سراسر توحید کے منافی ہے۔

اللہ تعالی نے اپنے قطعی احکام کے لئے ایسی واضح حجتیں اور روشن دلائل مقرر فرمائے ہیں جو ان احکامِ الٰہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور ان کے ذریعہ بندے احکامِ الٰہی سے واقف ہوتے ہیں۔

ان ادلہ میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کے حجت ہونے پر امت مسلمہ کا اجماع ہے، اور جن کی دلالت کو احکام پر منطبق کیا اور جنھیں متفقہ طور پر قبول کیا، اور ان ادلہ میں سے کچھ وہ ہیں جن میں امت نے اختلاف کیا۔

احکام شرعیہ کے دو ادلہ اور قانون اسلامی کے دو مآخذ ہیں جن کے حجت ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔ یہ وہی دو ادلہ ہیں جو عہد رسالت میں بھی اسلامی قانون سازی کی اساس تھے، اور یہ دونوں ہیں:

۱۔ قرآن مجید:

قرآن وہ لفظ ہے جسے رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا، جس کی تلاوت کو عبادت بنا دیا گیا، جس کی ایک چھوٹی سی سورت سے چیلنج کیا گیا، جس کا ہر حرف ہم تک تواتر کے ساتھ منتقل کیا گیا، جسے مصحف پاک کی دو دفتیوں کے درمیان لکھا گیا، جس کی ابتدا سورہ فاتحہ سے کی گئی، اور جس کا اختتام سورہ الناس کے ذریعہ کیا گیا (۴)۔

۲۔ سنت مطہرہ:

''سنت قرآن پاک کے سوا رسول اکرم ﷺ سے صادر ہونے والا ہر قول، فعل

وتقریر ہے''(۵)۔

لہذا زبان رسالت سے قرآن کے علاوہ جو الفاظ بھی صادر ہوئے یا جو افعال آپ سے ظاہر ہوئے (آغاز رسالت سے لے کر حیات مبارکہ کے آخری لمحہ تک) وہ سب مفہوم عام کے اعتبار سے حضور اکرم ﷺ کی سنت کے دائرے میں آتے ہیں؛ خواہ آپ ﷺ نے امت کے تمام افراد کے لئے عام حکم ثابت کیا ہو(اور یہی اصل ہے)، یا ایسا حکم ثابت کیا ہو جو آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہو، یا آپ کے بعض صحابہؓ کے ساتھ مخصوص ہو؛ خواہ آپ ﷺ کا فعل فطرت وعادت سے تعلق رکھتا ہو یا فطرت وعادت سے تعلق نہ رکھتا ہو، حضور اکرم ﷺ سے صادر ہونے والے ہر قول، عمل یا تقریر سے کوئی نہ کوئی اعتقادی یا عملی حکم شرعی ضرور ثابت ہوتا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ حکم وجوب کا ہو یا استحباب کا یا حرمت یا کراہت یا اباحت کا، اور اس سے بھی قطع نظر کہ وہ حکم قرآن پاک میں آئے ہوئے کسی حکم پر مبنی ہے یا مستقلاً کوئی نیا حکم ہے۔

سارے احکام شرعیہ خواہ اصلیہ ہوں یا فرعیہ، اعتقادی ہوں یا عملی، تکلیفی ہوں یا وضعی، حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں انھیں دونوں اصول یعنی کتاب وسنت سے اخذ کئے گئے ہیں۔

۳۔اجتہاد:

اجتہاد کا صدور نبی اکرم ﷺ سے اور آپ کے اہل نظر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے اجتہاد کو قرآن پاک کبھی برقرار رکھتا اور کبھی اسے برقرار نہ رکھتا، اور یہ بیان کرتا کہ زیادہ بہتر وہ ہے جسے حضور اکرم ﷺ نے اختیار نہیں فرمایا۔

صحابہ کرام بھی نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد سے کام لیتے، پھر حضور اکرم ﷺ سے جب ملاقات ہوتی تو اپنا اجتہاد حضور ﷺ کے سامنے پیش کرتے، تو حضور اکرم ﷺ کبھی ان اجتہادات کو برقرار رکھتے تو یہ اجتہادات سنت سے ثابت ہو جاتے، اور کبھی ان اجتہادات کو تسلیم نہ کرتے اور دوسرا حکم بیان فرماتے، تو پھر آپ کا بیان ہی اس مسئلہ میں بنیاد قرار پاتا۔

اس تفصیل کی روشنی میں یہ کہنا ممکن ہے کہ اس دور میں فقہ اسلامی کی بنیاد وحی کی دونوں

قسموں پر تھی : (۱) وحی متلو یعنی قرآن (۲) وحی غیر متلو یعنی سنت۔

حضور اکرم ﷺ نے اجتہاد کر کے صحابہ کرام اور بعد میں آنے والوں کو اجتہاد کی مشروعیت بتائی، اور امت کو یہ رہنمائی فرمائی کہ قرآن وسنت میں حکم کی دلیل نہ ملنے کی صورت میں ان کے لئے اجتہاد سے کام لینا لازم ہے۔ غالباً اسی بات کو پختہ اور ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے بعض صحابہ کو نبی اکرم ﷺ بعض مسائل میں اپنے سامنے اجتہاد کرنے کا حکم فرماتے، پھر درست جواب دینے والے کی تصویب فرماتے اور خطا کرنے والے کی غلطی پر متنبہ فرماتے۔

قرآن وسنت سے احکام اخذ کرنے کا طریقہ:

رہا قرآن تو صحابہ کرام اس کو سیکھتے تھے اور نحو وغیرہ کے قواعد کی ضرورت محسوس کئے بغیر اس کی مراد سمجھتے تھے، جس طرح وہ لوگ دل کی پاکیزگی، ذہن کی تیزی اور فطرت کی سلامتی اور عمدگی کے ذریعہ شارع کے مقاصد اور قانون سازی کی حکمت کا ادراک کرلیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کے بارے میں از خود بہت کم پوچھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اکرم ﷺ کے اصحاب سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ حضور اکرم ﷺ کی وفات تک ان لوگوں نے آپ ﷺ سے صرف تیرہ سوالات کئے جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں : "**یسألونک عن الشهر الحرام قتال فیه...**" (سورہ بقرہ: ۲۱۷) (لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں قتال کے بارے میں پوچھتے ہیں)، "**یسألونک عن المحیض ...**" (سورہ بقرہ: ۲۲۲) (لوگ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں)، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صحابہ کرام نفع دینے والی چیز ہی کے بارے میں سوال کرتے تھے (۶)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو واقعہ ابھی پیش نہ آیا ہو اس کے بارے میں سوال نہ کرو؛ کیونکہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا جو معدوم شئی کے بارے میں سوال کرتے تھے (۷)۔

امام قاسم نے فرمایا: تم لوگ ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہو جن کے بارے میں ہم لوگ سوال نہیں کرتے تھے، تم لوگ ایسی چیزوں کے بارے میں کرید تے ہو جن کے بارے میں ہم کرید نہیں کرتے تھے، تم لوگ ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات کرتے ہو جنھیں میں جانتا ہی نہیں، اگر میں جانتا تو میرے لئے ان کا چھپانا جائز نہ ہوتا'' (۸)۔

ابن اسحاق سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: جو لوگ مجھ سے پہلے وفات پا گئے میں نے ان سے بھی زیادہ صحابہ کرامؓ کو پایا۔ میں نے کسی قوم کو صحابہ سے زیادہ سادہ زندگی گذارنے والا اور کم سختی کرنے والا نہیں دیکھا'' (۹)۔

عبادہ بن نسی کندی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے ایک ایسی قوم (صحابہ کرام) کو پایا جو نہ تمھاری طرح سختی کرتے تھے اور نہ تمھاری طرح سوالات کرتے تھے (۱۰)۔

ابوعبیدہ نے اپنی کتاب ''مجاز القرآن'' میں لکھا ہے: یہ بات منقول نہیں کہ کسی صحابی نے قرآن کی کوئی آیت جاننے کے لئے رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا ہو (۱۱)۔

رہی سنت تو اگر قولی ہوتی تو وہ بھی ان کی زبان میں تھی جس کے معنی کو وہ لوگ جانتے تھے، اس کے مفہوم اور تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ اور اگر سنت فعلی ہوتی تو اس کا صحابہ کرامؓ مشاہدہ کرتے اور مشاہدہ کے مطابق اسے دوسروں سے نقل کرتے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ وضو کرتے تھے تو سیکڑوں صحابہ آپ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے، اور پھر وہ لوگ اس کو اختیار کر لیتے یہ فرق کئے بغیر کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ کام رکن سمجھ کر کیا ہے یا فرض یا واجب یا مستحب یا مباح سمجھ کر۔ اسی طرح حضرات صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ کے حج، نماز اور دوسری عبادات کا مشاہدہ کیا۔ اسی طرح ان حضرات نے حضور اکرم ﷺ کو حوادث و نوازل کے بارے میں فتوی دیتے ہوئے اور مقدمات کا فیصلہ کرتے ہوئے اور معاملات، سیر، سیاسیات کے بارے میں قطعی حکم لگاتے ہوئے سنا۔ ان سب کا ان حضرات نے خود مشاہدہ کیا اور ان کے مقاصد کو اچھی طرح جانا۔

اسی طرح انہوں نے بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا کہ حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام وغیرہ کے تصرفات کو دیکھ کر بعض تصرفات کی تعریف کرتے ہیں جس سے صحابہ یہ سمجھ جاتے کہ یہ معروف

(اچھا کام) ہے، اور بعض تصرفات پر نکیر فرماتے تو صحابہ کرامؓ جان لیتے کہ یہ منکر (برا کام) ہے، نبی اکرم ﷺ کے جو بھی فتاوی، فیصلے، اقرار وانکار منقول ہیں سب لوگوں کے درمیان میں ہوئے اور ان میں سے بہتوں کے سامنے وجود میں آئے۔ تو جس طرح طبیب کے ہم نشیں طویل صحبت اور ممارست کی وجہ سے اس کی تجویز کردہ دواؤں کے مقاصد جان لیتے ہیں (۱۲) اسی طرح حضرات صحابہؓ آپ ﷺ کے اقوال وافعال وغیرہ کے مقاصد جان لیتے تھے۔

اور رہا اجتہاد تو اس عہد میں اس کی مشروعیت اور اسے اختیار کرنے پر بہت سی دلیلیں ہیں۔ ان ہی میں سے ایک دلیل حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے انھیں جب یمن بھیجا تو دریافت فرمایا:

نبی اکرم ﷺ : جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ آئے گا تو کیا کروگے؟

معاذ بن جبلؓ : کتاب اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا۔

نبی اکرم ﷺ: اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ملے تو کیا کروگے؟

معاذ بن جبلؓ : رسول اللہ (ﷺ) کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔

نبی اکرم ﷺ : اگر رسول کی سنت میں بھی حکم نہ ملے تو کیا کروگے؟

معاذ بن جبلؓ : اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔

یہ جواب سن کر حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے سینے کو تھپتھپایا اور فرمایا: تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے (۱۳)۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث میں اجتہاد رائے کا جو جز ہے اس کی تشریح حضرت عمر بن الخطابؓ کے اس مکتوب سے ہوتی ہے جو انہوں نے ابوموسی اشعریؓ کو قاضی مقرر کرتے وقت لکھا تھا، جس میں آیا ہے:

''نظام قضاء کا قیام ایک محکم فریضہ اور ایسی سنت ہے جس کا ہمیشہ اتباع کیا گیا ہے''۔

پھر اس کے بعد فرمایا: جن معاملات میں قرآن وسنت کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے اور وہ

تمھارے دل میں کھٹکتے ہیں ان کے بارے میں خوب غور وفکر اور سمجھ بوجھ سے کام لو، ایسے نئے مسائل حل کرنے میں تم پہلے قرآن وسنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پیش آمدہ مسائل کو انھیں پر قیاس کرلو، اس کے بعد جو حل تمہاری رائے میں اللہ کی مرضی سے قریب تر اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ہو اسے اختیار کرلو'' (۱۴)۔

اسی لئے امام شافعیؒ نے رائے کی تشریح اجتہاد سے کی ہے اور اجتہاد کی تشریح قیاس سے کی ہے اور فرمایا: ''اجتہاد اور قیاس ایک ہی معنی کے دو نام ہیں'' (۱۵)۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی رائے تو صواب ہوتی تھی؛ کیونکہ ان کی رائے اللہ تعالی کی طرف سے ہوتی تھی، ہم لوگوں کی رائے تو ظن اور تکلف ہے'' (۱۶)۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اجتہاد اور رائے کا مفہوم اس عہد میں مندرجہ ذیل امور سے متجاوز نہیں تھا:

الف: جس کلام کے دو یا دو سے زیادہ محمل ہوں ان کا کوئی ایک محمل متعین کرنا، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا صحابہ کو بنو قریظہ میں نماز کا حکم دینے کے بارے میں ہے۔

ب: قیاس تمثیلی، جس میں کسی پیش آئے واقعہ کو کتاب وسنت میں مذکور اس کے مماثل کسی واقعہ کے ساتھ لاحق کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمارؓ نے جنابت کے تیمم کو غسلِ جنابت پر قیاس کرتے ہوئے زمین پر لوٹ لگائی (۱۷)۔

ج: مصلحت شرعی کا لحاظ کرنے یا سد ذریعہ یا عموم کی تخصیص یا مفہوم مخالف وغیرہ کا اعتبار کرنے میں اجتہاد۔ رسول اللہ ﷺ کی بڑی خواہش تھی کہ صحابہ کرام اجتہاد کو بروئے کار لائیں اور اس کی خوب مشق کرلیں، حتی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''حاکم کا اجتہاد اگر درست ہوا تو اسے دو اجر ملیں گے، اور اگر اس سے اجتہاد میں غلطی ہوگئی تو اسے ایک اجر ملے گا'' (۱۸)۔

بہت سے صحابہ کرام کے اجتہاد میں اس قدر دقت نظری آ گئی تھی کہ کثرت سے قرآن

مجید ان کے اجتہادات کے موافق نازل ہوتا، اور رسول اللہ ﷺ ان کے اجتہادات سے اتفاق کرتے، ایسا اس لئے ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت نے انھیں شارع حکیم کے مقاصد پر واقفیت اور فقہ اسلامی کے اسرار کے ادراک اور نصوص کے معانی کی معرفت کے وہ مواقع بہم پہنچائے جو بعد والوں کو وہ مواقع حاصل نہ ہوئے۔

دوسری فصل

عہدنبوی میں فتوی دینے والے صحابہ کرامؓ

جوصحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں فتوی دیا کرتے تھے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں :(۱) ابوبکر صدیقؓ (۲) عمر فاروقؓ (۳) عثمان غنیؓ (۴) علی مرتضیٰؓ (۵) عبدالرحمن بن عوف (۶) عبداللہ بن مسعود (۷) ابی بن کعب (۸) معاذ بن جبل (۹) عمار بن یاسر (۱۰) حذیفہ بن الیمان (۱۱) زید بن ثابت (۱۲) ابو الدرداء (۱۳) ابوموسی اشعری (۱۴) سلمان فارسی رضی اللہ عنہم۔

ان میں سے بعض کثرت سے فتوی دینے والے ہیں اور بعض کم فتوی دینے والے ہیں، جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فتاوی کثرت سے ہیں وہ ہیں: (۱) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ (۲) حضرت عمر بن الخطابؓ (۳) عبداللہ بن عمرؓ (۴) علی بن ابی طالبؓ (۵) عبداللہ بن عباسؓ (۶) زید بن ثابتؓ (۷) عبداللہ بن مسعودؓ۔ یہ سات ہیں، ان میں سے ہر ایک کے فتاوی کو اگر جمع کیا جائے تو ایک ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے، خلیفہ مامون کے پوتے ابوبکر محمد بن موسی بن یعقوب نے صرف حضرت ابن عباسؓ کے فتاوی کو بیس اجزاء میں یکجا کیا تھا۔

جوصحابہ کرام تعداد فتاوی کے اعتبار سے متوسط شمار ہوتے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ام المؤمنین ام سلمہ (۲) انس بن مالک (۳) ابوسعید خدری (۴) ابوہریرہ (۵) عثمان بن عفان (۶) عبداللہ بن عمرو بن العاص (۷) عبداللہ بن زبیر (۸) ابوموسی اشعری (۹) سعد بن ابی وقاص (۱۰) سلمان فارسی (۱۱) جابر بن عبداللہ (۱۲) معاذ بن جبل

(۱۳) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ تیرہ صحابہ کرام ہیں، اگر ان کے فتاوی کو جمع کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کے فتاوی پر مشتمل ایک ایک مختصر رسالہ تیار ہوسکتا ہے۔ ان متوسط صحابہ کی صف میں ان حضرات کو بھی شامل کیا جاتا ہے : (۱) طلحہ (۲) زبیر (۳) عبد الرحمن بن عوف (۴) عمران بن حصین (۵) ابوبکرہ (۶) عبادۃ بن صامت (۷) معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم۔ باقی اصحاب افتاء صحابہ کے فتاوی کی تعداد بہت کم ہے، کسی سے ایک مسئلہ منقول ہے، کسی سے دو اور کسی سے اس سے کچھ زیادہ۔ بڑی تلاش وجستجو کے بعد اگر ان سب کے فتاوی جمع کئے جائیں تو ممکن ہے کہ ایک مختصر رسالہ تیار ہوجائے (۱۹)۔

صحابہ کرامؓ اپنے فتاوی میں نئے پیش آنے والے جزئی واقعات کا حکم کتاب وسنت کی جزئی نصوص سے معلوم کرتے تھے نص کے ظاہر سے جس میں معنی ومدلول یعنی لفظ کے مفہوم اور اشارے اور اس سے مربوط تمام قرائن اخذ کئے جاتے۔ صحابہ کرام کو نص کے الفاظ یا دلالت سے جو حکم معلوم ہوتا اسے لوگوں کے سامنے بیان کردیتے، اور لوگ صحابہ سے وہ حکم سیکھ لیتے۔ اسی طرح جب تک صحابہ کو یقین کی ٹھنڈک محسوس نہ ہوتی اور یہ احساس نہ ہوجاتا کہ انہوں نے واقعہ کا حکم دریافت کرنے میں پوری قوت صرف کردی ہے، اس وقت تک وہ لوگ اس مسئلے کے بارے میں تحقیق وجستجو ترک نہ کرتے۔

کبار صحابہ کا عہد:

حضور اکرم ﷺ کے بعد کبار صحابہ اور خلفاء راشدین کا دور آیا، یہ دور سن ۱۱ھ سے لے کر سن ۴۰ھ تک پر محیط ہے، اصحاب فقہ وفتاوی صحابہ کرام کو ''قراء'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عہد:

احکام شرعیہ معلوم کرنے کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جو طریقہ کار تھا اس کا

خلاصہ میمون بن مہران اس طرح بیان کرتے ہیں : ''حضرت ابوبکرؓ کا معمول یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ آتا تو قرآن میں غور فرماتے، اگر قرآن میں اس کا حکم پا جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ اگر قرآن میں اس کا حکم نہ ملتا اور اس بارے میں انھیں رسول اللہ ﷺ کی کسی سنت کا علم ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ لیکن اگر انھیں کتاب وسنت میں کوئی حکم نہ ملتا تو مسلمانوں (صحابہ) سے دریافت کرتے اور فرماتے: میرے پاس ایسا ایسا مقدمہ آیا ہے، کیا آپ لوگوں کو اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کے کسی فیصلے کا علم ہے؟ تو بسا اوقات ان کے پاس پوری جماعت اکٹھی ہوجاتی جن میں سے ہر شخص اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کے فیصلے کا ذکر کرتا تو حضرت ابوبکر فرماتے: تمام تعریفیں اس اللہ تعالی کی ہیں جس نے ہم لوگوں میں ایسے افراد بنائے جو ہمارے نبی اکرم ﷺ کی سنتیں اور تعلیمات یاد رکھتے ہیں، اگر انھیں صحابہ کرام سے دریافت کرنے کے باوجود اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کی سنت نہیں ملتی تو کبار صحابہ کو جمع کر کے مشورہ فرماتے اور جس حکم پر اتفاق رائے ہوجاتا اس کے مطابق فیصلہ فرماتے''(۲۰)۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دستور یہ تھا کہ جب ان سے قطعی فیصلہ طلب کیا جاتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتے، خواہ کسی نص کی تفسیر اور اس کی دلالت جاننے سے متعلق ہو یا خالص اجتہادی معاملے سے۔ پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ جب ان سے کلالہ کی تفسیر دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا : ''میں کلالہ کے بارے میں اپنی رائے سے ایک بات کہتا ہوں، اگر وہ درست ہو تو اللہ تعالی کی جانب سے ہے، اور اگر خطا ہو تو میرے اور شیطان کی جانب سے ہے۔ کلالہ سے مراد باپ اور اولاد کے علاوہ دوسرے رشتہ دار ہیں''(۲۱)۔

اس کی دوسری مثال حدیث کے الفاظ ''**إلا بحقها**'' کی تشریح میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ جملہ ہے: ''**والزكاة من حقها**''۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ نے اس حدیث نبوی کے ذریعہ ان پر اعتراض کیا:

''أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله، فإذا قالوها فقد عصموا منى دماءهم وأموالهم إلا بحقها'' (۲۲) (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کرتا رہوں، یہاں تک کہ وہ لاالہ الااللہ پڑھ لیں۔ جب کلمہ پڑھ لیا تو انہوں نے اپنے خون اور اموال مجھ سے بچالئے مگر اس کے حق سے)۔

اس حدیث کے آخر میں ''إلا بحقها'' کے ذریعہ جو استثناء ہے حضرت عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد صرف تین چیزیں ہیں: (۱) محصن (شادی شدہ آزاد) ہونے کے باوجود زنا کرنا (۲) ناحق کسی کو قتل کرنا (۳) مرتد ہوجانا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ زکوۃ نہ دینا ان تینوں میں سے کسی ایک کے دائرے میں نہیں آتا، پھر آپ کس طرح قتال کریں گے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: زکوۃ کی ادائیگی بھی ''إلا بحقها'' میں آتی ہے۔ بخدا میں ان لوگوں سے قتال کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوۃ میں تفریق کی، خدا کی قسم اگر انہوں نے اونٹ کی ایک رسی بھی دینے سے انکار کیا جس کو وہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں ادا کرتے تھے، تو میں ان سے قتال کروں گا۔

دوسری قسم کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے نانی کو وارث بنایا اور دادی کو وارث نہیں بنایا، اس پر ایک انصاری صحابی نے اعتراض کیا کہ ''آپ نے ایک ایسی عورت کو میت کا وارث بنایا کہ اگر اس کا انتقال ہو تو میت کو اس کے مال میں سے کچھ نہ ملے، اور ایسی عورت کو چھوڑ دیا کہ اگر اس کا انتقال ہوتا تو میت اس کے پورے مال کا وارث بن جائے، انصاری کی یہ بات سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے قول سے رجوع فرمایا اور میراث کے چھٹے حصہ میں دونوں کو شریک کردیا'' (۲۳)۔

اسی طرح کی ایک مثال ان کا یہ فیصلہ تھا کہ بیت المال سے تمام لوگوں کو عطیے برابر برابر دیئے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: آپ ان مہاجرین کو جنہوں نے مال اور وطن کو چھوڑ کر حضور ﷺ کے حکم پر ہجرت کی، ان لوگوں کے برابر کس طرح کررہے ہیں جو مجبوراً اسلام میں داخل ہوئے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: مہاجرین اللہ کے لئے اسلام لائے

تھے، ان کا اجر اللہ تعالی کے ذمہ ہے، دنیا میں تو ہر شخص کو روزی پہنچتی ہے(۲۴)۔ جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے لوگوں کے عطیوں میں دین کی راہ میں آزمائش، اسلام میں تقدم اور ہجرت کی بنا پر فرق کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے اجتہاد کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے بیعت کے ذریعہ خلیفہ کی تعیین پر امام اول کی طرف سے نامزدگی کو قیاس کیا؛ چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا، صحابہ نے بھی ان کے اس اقدام سے اتفاق کیا۔

ان کے پاس خالد بن ولید کا خط آیا کہ عرب کے ایک علاقے میں ایک ایسا شخص ہے جو مردوں کے ساتھ وہی فعل کرتا ہے جو عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کرام کو بلا کر مشورہ کیا، ان میں حضرت علیؓ بھی تھے، ان حضرات میں سب سے سخت رائے انھیں کی تھی، لہذا انہوں نے فرمایا: اس گناہ کا ارتکاب گذشتہ اقوام میں سے صرف ایک قوم نے کیا تھا، اس قوم کو خداوند تعالی نے جو سزا دی وہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ میری رائے ہے کہ ایسے لوگوں کو آگ میں جلا دیا جائے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن ولیدؓ کو لکھا کہ ان لوگوں کو جلا دیا جائے، تو ان لوگوں کو جلا دیا گیا(۲۵)۔

عہد صدیقی کے فقہی امتیازات یہ ہیں:

الف: غیر منصوص واقعات میں پوری وسعت کے ساتھ قیاس کو اختیار کرنا اور کسی صحابی کی طرف سے اس پر نکیر نہ ہونا۔

ب: احکام شرعیہ کے دلائل میں ایک دلیل کے طور پر اجماع کا واضح طور پر رونما ہونا۔ اجماع منعقد ہونے میں اس بات سے بھی مدد ملی کہ صحابہ (فقہاء صحابہ) اتنے قلیل تھے کہ ان کا اکٹھا ہونا اور متفق ہونا دشوار نہیں تھا۔ بہت سے معاملات میں صحابہ کا اجماع منعقد ہوا، مثلاً نصب امام کے وجوب پر اجماع، مرتدین کے قتال پر اجماع؛ حالانکہ شروع میں اختلاف ہوا تھا، اس بات پر اجماع کہ مرتد کو قید نہیں کیا جائے گا، اور قرآن پاک کے جمع و کتابت پر اجماع وغیرہ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عہد:

حضرت عمر فاروقؓ نے قاضی شریح کو عہدہ قضا سونپتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دلائل شرعیہ سے استنباط احکام کے سلسلہ میں ان کا کیا طرز تھا۔ حضرت عمرؓ کی سب سے نمایاں بات یہ تھی کہ آپ صحابہ کرام سے بہت کثرت سے مشورہ اور بحث کرتے؛ تا کہ سب سے افضل فہم حاصل ہوجائے اور حکم شرعی کی تطبیق کے لئے سب سے بہتر راہ مل جائے۔ تشریعی مسائل میں ان کا نقطۂ نظر اس دوا فروش طبیب کی طرح ہوتا تھا جو دواؤں کا ایسا نسخہ تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے سائڈ ایفکٹس کے بغیر اصل مرض سے شفا مل جائے۔ اسی لئے انہوں نے ہمارے لئے ممتاز فقہ اور غیر معمولی فقہی سرمایہ چھوڑا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے حادثہ پر حضرت ابراہیم نخعی (متوفی ۹۷ھ) نے فرمایا: ''دس میں سے نو حصہ علم کا ختم ہوگیا'' (۲۶)، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: ''حضرت عمرؓ جب کسی راہ پر چلتے ہم اسے آسان پاتے'' (۲۷)۔ حضرت عمرؓ اصولی اور کلی ذہن اور تیز احساس رکھتے تھے، بہت جلد جزئیات کو کلیات سے مربوط کردیتے، فروع کو عام اصول وضوابط کی طرف لوٹاتے۔ عہد نبوی اور عہد خلافت صدیقی دونوں میں ان کا یہی حال تھا، اور اپنے دور خلافت میں بھی اسی روش پر قائم رہے۔

حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے تعلیم حاصل کی تھی اور آپ ﷺ کی شاگردی کی تھی۔ وہ بسا اوقات حضور اکرم ﷺ کو دیکھتے کہ آپ کسی اچھی بات کا امت کو حکم دینے سے اس بنا پر توقف فرماتے کہ امت مشقت میں مبتلا ہوجائے گی۔ آپ ﷺ اکثر فرمایا کرتے: اگر مجھے امت کے مشقت میں پڑنے کا ڈر نہ ہوتا تو میں اسے فلاں چیز کا حکم دیتا... اور کبھی آپ ﷺ کچھ چیزوں سے مسلمانوں کو روکتے، پھر آپ ﷺ محسوس فرماتے کہ ممانعت کا جو محرک تھا وہ ختم ہوگیا تو پھر ان چیزوں کی اجازت مرحمت فرماتے، اور کبھی آپ ﷺ کسی چیز کو حرام قرار دینے کا ارادہ کرتے، اور صحابہ آپ ﷺ کو اس حرمت کی وجہ سے لوگوں کو پہنچنے

والی مشقت کے بارے میں بتاتے تو آپ ﷺ مشقت اور تنگی دور کرنے کے لئے انھیں اس چیز کی اجازت دے دیتے۔ حضرت عمرؓ یہ بھی دیکھتے تھے کہ جب بھی حضور اکرم ﷺ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو ان میں سے جو آسان ہوتی اسے اختیار فرماتے۔ یہ تمام باتیں حضرت عمرؓ پر اثر انداز ہوئیں تو آپ کو اس حقیقت کا علم وادراک ہوا کہ شریعت اسلامیہ کے کچھ بنیادی مقاصد اور اہداف ہیں جن کا حاصل کرنا اور ان کے دریافت کی کوشش کرنا ضروری ہے، اور ان احکام شرعیہ کی کچھ علتیں ہیں جن میں سے بعض کا ذکر نصوص میں صراحۃً اور بعض کا اشارۃً آیا ہے، نئے پیش آنے والے حوادث ونوازل کو احکامِ الٰہی کے تحت لانے کے لئے ضروری ہے کہ جن احکام شرعیہ کی علتوں کا ذکر نصوص میں نہ صراحۃً ہے اور نہ اشارۃً، ان کو استنباط کے ذریعہ دریافت کی جائیں؛ تاکہ کوئی چیز اللہ تعالی کی حاکمیت کے دائرے سے باہر نہ جائے؛ اور تاکہ لوگ شریعت اسلامیہ کے دائرے سے باہر اپنے معاملات کے احکام اور مشکلات کا حل تلاش نہ کرنے لگیں۔

اسی لئے آپ حضرت عمرؓ کے اجتہادات میں استنباط کے واضح طریقے پائیں گے۔ حضرت عمرؓ کے فتاوی کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی مصلحت کے ذریعہ حکم کی تعلیل کی، کبھی سد ذرائع کا اصول اختیار فرمایا، کبھی دفع مفاسد کے اصول پر کاربند ہوئے، کبھی شرعی حکمت عملی کو اپنایا، کبھی بعض احکام پر علت کے نہ پائے جانے یا تطبیق کی بعض شرائط کے مفقود ہونے کی وجہ سے (خاص حالات اور واقعات میں) عمل درآمد کو روک دیا۔ حضرت عمرؓ کے اجتہادات کے بعض نمونے یہ ہیں: (۱) آپ نے نبی اکرم ﷺ سے اسیران بدر کے قتل کرنے کا مطالبہ کیا (۲) عورتوں کے لئے حجاب کی تجویز رکھی (۳) نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ لوگوں میں اس حدیث کی اشاعت نہ کی جائے کہ ''جس نے کلمہ لا إلہ إلا اللہ پڑھ لیا جنت میں داخل ہوگا''؛ تاکہ کہیں لوگ محض ایمان پر تکیہ نہ کر بیٹھیں (۴) انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے مؤلفۃ قلوب کا حصہ ختم کرنے کی تجویز رکھی۔ (۵) انہوں نے جہاد میں

مفتوحہ اراضی غازیوں میں تقسیم کرنے کا سلسلہ موقوف فرمایا۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا عہد:

حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت اس شرط اور عہد کے ساتھ کی گئی کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسول اور اپنے دونوں پیش رو خلفاء حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے اسوہ وسیرت پر عمل پیرا ہوں گے۔ حضرت علیؓ نے صرف اتنا عہد کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل کریں گے، پھر اپنے علم اور طاقت کے مطابق عمل کریں گے۔ حضرت عثمانؓ نے جب اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ کسی تحفظ کے بغیر شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے تو حضرت عبدالرحمن بن عوف نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے دور میں قرآن وسنت کے بعد تیسرے مصدر قانون شیخین کی سیاست وسیرت کا اضافہ کیا گیا۔ اسی کے بارے میں حضرت علیؓ نے تحفظ سے کام لیا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ کا دور خلافت آیا تو انہوں نے چند ایسے مسائل میں اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کی کوشش کی جن کے بارے میں شیخین اجتہاد سے ایک فیصلہ فرما چکے تھے، جیسے کہ ام ولد کی خرید وفروخت کے مسئلے میں۔

تعداد فتاوی کے اعتبار سے جو صحابہ متوسط ہیں ان میں حضرت عثمانؓ بھی ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے دور خلافت میں ان کے سامنے جو معاملات پیش کئے گئے ان میں سے اکثر کے بارے میں حضرت ابوبکر یا حضرت عمرؓ کا اجتہاد موجود تھا تو انہوں نے شیخین ہی کے اجتہاد پر عمل کرنے کو ترجیح دی، لیکن انہوں نے بعض مسائل میں شیخین کی طرح اجتہاد بھی فرمایا۔ ایک بار ایک مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے اپنی رائے ظاہر کر کے حضرت عثمانؓ کی رائے طلب کی تو انہوں نے فرمایا: ''اگر اپنی رائے پر آپ چلنا چاہیں تو آپ کی رائے درست ہے، اور اگر اپنے پیش رو ابوبکرؓ کی رائے پر چلیں تو وہ بہترین صاحب الرائے تھے'' (۲۸)۔ اسی طرح انہوں نے اجتہاد کرتے ہوئے موسم حج میں منیٰ میں بجائے دو رکعت قصر پڑھنے کے چار رکعت

پڑھی، ایسا انہوں نے دو دلیلوں سے کیا: (۱) انہوں نے مکہ میں نکاح کرلیا تھا تو انہوں نے سمجھا کہ مکہ والوں کی طرح ان کے لئے بھی منیٰ میں قصر کرنا درست نہیں، (۲) انھیں خوف ہوا کہ کہیں بدولوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ یہ نماز دو ہی رکعت والی ہے۔

حضرت عثمانؓ کا یہ بھی اجتہاد تھا کہ انہوں نے سب پر زید بن ثابت کی قرأت کی اتباع لازم کردی، اور انہوں نے سمجھا کہ اسی میں اختلاف سے حفاظت اور دوری ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا عہد:

حضرت علیؓ نصوص سے فہم واستنباط اور تطبیق کے طریقوں میں، اور جزئیات کو کلیات سے مربوط کرنے کی شدید خواہش میں حضرت عمرؓ سے زیادہ مشابہ تھے، اہل مدینہ میں سب سے بڑے قاضی شمار کئے جاتے تھے، حضور اکرم ﷺ نے انھیں یمن کا عہدۂ قضا تفویض فرمایا اور ان کے حق میں دعا فرمائی: ''اللھم ثبت لسانه و اھد قلبه'' (۲۹) (اے اللہ! ان کی زبان کو (حق گوئی پر) ثابت رکھ اور ان کے دل کی رہبری فرما)۔

اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں باتوفیق اور مشکل مقدمات کی گرہوں کو کھولنے والے تھے۔ وہ اپنے علم کے بارے میں خود فرماتے ہیں: ''بخدا مجھے ہر آیت کے بارے میں معلوم ہے کہ کس بارے میں نازل ہوئی؟ کہاں نازل ہوئی؟ اور کن لوگوں کے متعلق نازل ہوئی؟ میرے رب نے مجھے سمجھدار دل اور حق گو زبان عطا فرمائی'' (۳۰)۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی مقدمہ یا استفتاء پیش ہوتا تو کتاب اللہ سے فیصلہ فرماتے اور فتوی جاری کرتے (آپ جان چکے کہ ان کا علم قرآن کس طرح وسیع وعمیق تھا)، پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت سے۔ ان کے علم سنت کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں: ''انھیں لوگوں میں سب سے زیادہ سنت رسول کا علم ہے''۔ پھر اجتہاد فرماتے، اجتہاد میں مقاصد شریعت کو مدنظر رکھتے ہوئے قیاس، استصحاب حال، استحسان اور استصلاح سے کام لیتے۔ ان سے جب شراب پینے والوں کی سزا میں اضافہ کرنے کے بارے میں مشورہ کیا گیا تو سکر (نشہ) کو قذف

(زنا کا الزام لگانا) پر قیاس کرتے ہوئے سزا بڑھانے کا مشورہ دیا؛ کیونکہ نشے کی حالت میں انسان اکثر بہتان تراشی کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ان سے مشورہ فرمایا کہ اگر پوری جماعت ایک آدمی کے قتل میں شریک ہوتو کیا کیا جائے؟ انہوں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اگر ایک پوری جماعت چوری کے جرم میں شریک ہوتو کیا آپ سب کے ہاتھ کاٹیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں، حضرت علیؓ نے فرمایا: اسی طرح اس پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کا یہ جواب سن کر اپنا مشہور جملہ فرمایا : ''اگر تمام باشندگان صنعاء مل کر ایک شخص کو قتل کریں گے تو میں ایک شخص کی وجہ سے ان سب کو قتل کردوں گا''۔

اس فتوی میں انہوں نے سرقہ پر قیاس کیا؛ کیونکہ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں جرائم میں مجرموں کی طرف سے پورا پورا مجرمانہ قصد واقدام پایا جارہا ہے، لہذا دونوں میں سزا جاری کرنا ضروری ہے۔

جن زندیق مرتدین نے حضرت علیؓ کو معبود کہا تھا حضرت علیؓ نے اصول استحسان سے کام لیتے ہوئے ان مرتدین کے جلانے کا حکم دیا؛ حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ مرتد اور کافر کے قتل کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کا معمول کیا تھا، لیکن انہوں نے چاہا کہ ارتداد کی اس بدترین شکل پر سنگین ترین سزا دیں؛ اس لئے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کا ارتداد بڑا بھیانک ہے لہذا ان کے لئے سب سے بھیانک سزا کا حکم فرمایا؛ تاکہ آئندہ کوئی اس بدترین جرم کا ارتکاب نہ کرے، اسی موقع پر حضرت علیؓ نے یہ رجزیہ شعر کہا :

''لما رأیت الأمر أمرا منکراً أججت ناری ودعوت قنبرا''

(جب میں نے اس جرم کو بہت بھیانک سمجھا تو آگ جلائی اور قنبر کو بلایا)۔

ایک عورت کا شوہر غزوہ میں گیا ہوا تھا، حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع ملی کہ بعض لوگ اس عورت کے گھر جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو اس عورت کو بلانے کے لئے بھیجا تاکہ

اسے تنبیہ کردیں کہ اجنبیوں کو شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے گھر میں نہ آنے دے، ان دنوں وہ عورت حاملہ تھی۔ جب قاصد نے عورت کو خبر دی کہ امیر المؤمنین تمھیں طلب کررہے ہیں تو وہ گھبراہٹ میں نکلی، راستے میں اس کا حمل ساقط ہوگیا، ایک بچہ زندہ حالت میں پیدا ہوا جس نے پیدائش کے وقت آواز نکالی، پھر بچے کا انتقال ہوگیا۔ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا، اکثر صحابہ نے جن میں عثمان بن عفانؓ، اور عبدالرحمن بن عوفؓ بھی تھے، عرض کیا: ''آپ نے تو ادب سکھانے کے لئے اس کو طلب کیا تھا، آپ کے ذمہ کچھ لازم نہیں''۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا : ''ابوالحسن! آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا : ''ان حضرات کی رائے میں نے سن لی، اگر اجتہاد میں پوری کوشش کے بعد ان حضرات کی یہی رائے بنی ہے تو انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کردی ہے، اور اگر آپ سے تقرب کی خاطر یہ رائے دی ہے تو آپ کو دھوکا دیا ہے، میری رائے یہ ہے کہ مجھے اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ آپ کے حسن نیت کی وجہ سے آپ کو گناہ نہیں ہوگا لیکن بخدا بچے کا تاوان آپ پر لازم ہوگا''۔ حضرت عمرؓ نے جواب سن کر فرمایا : ''بخدا آپ نے مجھ سے حق بات کہی، میں آپ کو اللہ تعالی کی قسم دیتا ہوں کہ آپ جب تک بچے کی دیت اہل قریش پر تقسیم نہ کردیں اس وقت تک نہ بیٹھیں''(۳۱)۔

فقہاء صحابہ وتابعین کا عہد:

سن ۴۰ھ سے یعنی خلفاء راشدین اور قراء صحابہ کا عہد ختم ہونے پر اس دور کا آغاز ہوتا ہے، اور فقہاء صحابہ اور کبار تابعین کا عہد شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں بھی اسلامی قانون سازی انھیں خطوط پر چلی جس پر خلفاء راشدین کے عہد میں تھی۔ اس عہد میں بھی کتاب وسنت، اجماع وقیاس اس سے پہلے والے دور کی طرح اسلامی قانون سازی کے مآخذ تھے، لیکن چند باتوں میں یہ دور پہلے دور سے مختلف ہے:

۱۔ اس دور میں لوگوں کے اندر معانی میں غواصی اور نصوص کے ماوراء میں تعمق کا رجحان

زیادہ بڑھ گیا۔

۲۔ سنت کو اختیار کرنے کے بارے میں لوگوں کی راہیں مختلف ہوگئیں۔ سیاسی اختلافات اور مذہبی اور کلامی فرقوں شیعہ وخوارج کے ظہور کی وجہ سے سنت کے بارے میں ان کے نقطہائے نگاہ مختلف ہو گئے۔ شیعہ نے ائمہ معصومین سے منقول روایات کے علاوہ تمام احادیث مسترد کردیں، خوارج نے اخبار وآحاد کو عموماً اور ان روایات کو خصوصاً ترک کردیا جن کی تائید قرآن سے نہ ہوتی ہو۔

۳۔ فرقہ بندی کی وجہ سے اجماع کا تحقق ممکن نہیں رہا، خاص طور سے اس لئے کہ ہر فرقہ کا اعتماد دوسرے فرقوں کے تمام علماء سے اٹھ گیا، لہذا ایک فرقہ دوسرے فرقے کے علماء کی رائے کو قابل اعتناء نہیں سمجھتا تھا؛ خواہ اس کے موافق ہو یا مخالف، اجماع منعقد نہ ہونے میں اس بات کا بھی دخل تھا کہ فقہاء صحابہ مختلف اسلامی شہروں میں پھیل گئے تھے؛ اس لئے مسائل پر گفتگو اور تبادلہ خیال کے لئے ان کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں تھا۔

۴۔ اس دور میں احادیث وسنن کی روایت کا عام چلن ہوگیا تھا، اس سے پہلے یہ صورت حال نہ تھی۔

۵۔ اسی دور میں بہت سے معروف اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) وضع احادیث (احادیث گھڑنے) کا فتنہ ظہور پذیر ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے : ''ہم لوگ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کی جانے والی تمام حدیثوں کو قبول کرتے تھے جب تک جھوٹی روایات بیان نہیں کی جاتی تھیں، لیکن جب لوگ ہر اچھی بری سواری پر سوار ہونے لگے (یعنی روایت میں احتیاط ترک کردی) تو ہم نے ہر حدیث کو قبول کرنا ترک کردیا'' (۳۲)۔

تیسری فصل

اسلامی قانون سازی عہد صحابہ کے بعد

سن ۹۰ ھ سے ۱۰۰ ھ کے درمیان صحابہ کرام کا مبارک عہد ختم ہو گیا اور تابعین کے عہد کا آغاز ہوا اور فقہ وفتوی کی ذمہ داری علماء تابعین پر آ گئی۔ کوفہ میں آخری صحابی کی وفات ۸۶ ھ میں ہوئی۔ مدینہ میں سب کے بعد وفات پانے والے صحابی حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ تھے، ان کی وفات ۹۱ ھ میں ہوئی (۳۳)، بصرہ میں وفات پانے والے آخری صحابی حضرت انس بن مالکؓ کی وفات ۹۱ ھ میں ہوئی، اور ایک قول ۹۳ ھ ہے (۳۴)، شام میں وفات پانے والے آخری صحابی عبداللہ بن یسر ہیں، انہوں نے ۸۸ ھ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی (۳۵)، سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی عامرؓ بن واثلہ بن عبداللہ (ابوطفیل) ہیں، جن کی وفات ۱۰۰ ھ میں ہوئی (۳۶)۔

اس عہد میں فقہ وفتوی میں مرجع بننے والے اکثر افراد وہ موالی (آزاد کردہ غلام) ہیں جن میں سے اکثر نے فقہاء صحابہ کی صحبت میں زندگی گزاری، مثلاً: حضرت ابن عمر کے غلام نافع، حضرت ابن عباس کے غلام عکرمہ، فقیہ مکہ عطاء بن ابی رباح، اہل یمن کے فقیہ طاؤس، یمامہ کے فقیہ یحییٰ بن ابی کثیر، کوفہ کے فقیہ ابراہیم نخعی، بصرہ کے فقیہ حسن بصری، بصرہ کے دوسرے فقیہ ابن سیرین، اور خراسان کے فقیہ عطاء الخراسانی، وغیرہ، اور مدینہ منورہ کو اپنے قریشی فقیہ سعید بن المسیب کی وجہ سے خصوصیت وامتیاز حاصل تھا۔ اللہ تعالی ان سب پر رحمت کی بارش کرے۔ یہ سب تابعین اپنے اساتذہ فقہاء صحابہ کے فتاوی سے شاذ ونادر ہی تجاوز کرتے، اسی لئے احکام شرعیہ کے استنباط کے سلسلہ میں ان کے مناہج اور فقہاءِ صحابہ کے مناہج میں کسی بڑے فرق کا پتہ لگانا بہت دشوار ہے؛ لیکن استنباط احکام کے طریقے اس دور میں پہلے سے زیادہ ظاہر

اور واضح ہونے لگے تھے۔حسن بن عبید اللہ نخعی فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے دریافت کیا : ''آپ جو کچھ فتوی دیتے ہیں کیا یہ سب آپ نے صحابہ سے سنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں، میں نے عرض کیا: آپ نے صحابہ سے جو بات نہیں سنی ہے اس پر بھی فتوی دیتے ہیں؟ فرمایا: جو کچھ میں نے سنا وہ تو سنا ہی ہے، اور نئے مسائل جو میں نے نہیں سنے ہیں انھیں میں سنے ہوئے احکام پر قیاس کر لیتا ہوں''(۳۷)۔

اس دور میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ بہت سے مسائل میں مفتیوں کے درمیان اختلاف رائے کا ظہور ہے، اسی طرح امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیزؒ کے دو کام ہیں جو اسلامی قانون کی راہ میں رہنما ثابت ہوئے: پہلا کام یہ کیا کہ انہوں نے احادیث کو یکجا کرنے اور لکھنے کا حکم دیا، لہذا ہر شہر کے علماء کے پاس احادیث کا جو ذخیرہ تھا اسے وہاں کے لوگ رجسٹر میں لکھنے لگے تھے(۳۸)۔ دوسرا کام یہ کیا کہ انہوں نے بہت سے شہروں میں فتوی کا کام چند متعین لوگوں کے سپرد فرمایا، مثلاً انہوں نے مصر میں افتاء کا کام تین افراد کے سپرد کیا: ان میں دو موالی (آزاد کردہ غلام) تھے :(۱) یزید بن ابی حبیب، (۲) عبد اللہ بن ابی جعفر، اور ایک عرب تھے ان کا نام جعفر بن ربیعہ تھا۔ اس پر کسی نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے فرمایا : ''میرا کوئی جرم نہیں، چونکہ موالی اپنے کو بلند کرتے جا رہے ہیں اور تم لوگ بلندی کی طرف نہیں جا رہے ہو(۳۹)۔

تدوین احادیث کا انہوں نے جو حکم فرمایا اس کی وجہ ابو بکر محمد بن عمرو بن حزم انصاری کے نام اپنے ایک مکتوب میں یہ درج کی ہے : ''.... رسول اللہ ﷺ کی جو حدیث، سنت یا اس طرح کی جو چیز ملے اسے میرے لئے لکھ دیجئے؛ کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے اٹھ جانے کا خوف ہے''(۴۰)۔

تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کا دور:

اس دور کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں : ''اس دور کے فقہاء نے نبی

اکرم ﷺ کی احادیث اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے فیصلوں اور اجتہادات کو اختیار کیا اس کے بعد خود بھی اجتہاد کیا''۔ اس طبقہ کے علماء کا طریق استنباط ایک دوسرے کے مشابہ تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ تمام مجتہد رسول اکرم ﷺ کی مسند ومرسل احادیث سے استدلال کرتے، اسی طرح صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال سے بھی استدلال کرتے؛ اس لئے کہ صحابہ وتابعین کے اقوال دوحال سے خالی نہیں: یا تو وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے منقول احادیث ہیں جسے روایت کرتے وقت کسی صحابی یا تابعی پر موقوف کر دیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت کرنے سے بچنے کے لئے، اور الفاظ حدیث میں کمی یا زیادتی کے خوف سے آپ ﷺ سے روایت کرنے میں احتیاط اور تورع کی بنا پر۔ یا یہ اقوال خود صحابہ وتابعین کے ہوں جنھیں انہوں نے نصوص سے مستنبط کیا ہے یا اپنی رائے وقیاس سے اجتہاد کر کے کہا ہے، اور صحابہ اور تابعین ان تمام چیزوں میں اپنے بعد والوں سے بہتر ہیں، حق تک زیادہ پہنچنے والے ہیں، زمانہ کے لحاظ سے زیادہ قدیم اور زیادہ پختہ علم والے ہیں، لہذا ان کے اقوال پر عمل کرنا متعین ہے الا یہ کہ ان میں خود باہم اختلاف ہو، یا رسول اللہ ﷺ کی حدیث صحابہ کے قول سے بظاہر مخالف ہو۔ بہر حال جب خود احادیث میں اختلاف ہو تو صحابہ کے اقوال کی طرف رجوع کیا جائے گا، اگر صحابہ ان میں سے کسی حدیث کو منسوخ کہتے ہوں یا اسے ظاہری مفہوم سے پھیرتے ہوں یا اس کی صراحت تو صحابہ نے نہ کی ہو لیکن سب نے اس حدیث کو ترک کر دیا ہو اور اس کے حکم کے قائل نہ ہوں تو ان کا یہ طرز عمل اس حدیث کو معلل یا منسوخ کہنے کے حکم میں ہوگا یا اس کی تاویل کرنے کے درجہ میں ہوگا، ان سب امور میں ائمہ مجتہدین ان کی اتباع کرتے، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ اور تابعین کے مختلف مذاہب ہوتے تو ہر فقیہ اپنے اہل شہر صحابہ وتابعین اور مشائخ کے مذہب کو اختیار کرتا؛ کیونکہ ہر فقیہ ان کے اقوال میں صحیح وسقیم سے سب سے زیادہ واقف ہوتا، اور ان کے مناسب اصولوں کو زیادہ یاد رکھتا ہے ..... چنانچہ اہل مدینہ کے نزدیک عمر، عثمان، ابن عمر، عائشہ، ابن عباس، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین میں

سے ان صحابہ کرام کے تلامذہ مثلاً سعید بن المسیبؒ (متوفی ۹۳ھ) عروۃ بن الزبیرؒ (متوفی ۹۴ھ) سالمؒ (متوفی ۱۰۶ھ) عطاء بن ابی یسارؒ (متوفی ۱۰۳ھ) قاسم بن محمدؒ (متوفی ۱۰۸ھ) عبید اللہ بن عبد اللہؒ (متوفی ۹۹ھ) زہریؒ (متوفی ۱۲۴ھ) یحییٰ بن سعیدؒ (متوفی ۱۴۳ھ) زید بن اسلمؒ (متوفی ۱۳۶ھ) ربیعۃ الرائیؒ (متوفی ۱۳۶ھ) کے مذاہب دوسرے صحابہ اور تابعین کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول تھے، اور آپ کو معلوم ہے کہ امام مالک ان ہی کے اقوال کو قابل حجت مانتے تھے۔

اہل کوفہ کے نزدیک حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کے تلامذہ کا مذہب، اور حضرت علیؓ، قاضی شریحؒ (متوفی ۷۷ھ) شعبیؒ (متوفی ۱۰۴ھ) کے فیصلے، اور ابراہیم نخعیؒ (متوفی ۹۶ھ) کے فتاوی زیادہ اختیار کرنے کے لائق ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''جب امام مسروق (متوفی ۶۳ھ) میراث میں دادا اور بھائیوں کو شریک کرنے کے بارے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کی طرف مائل ہوئے تو ان سے حضرت علقمہ (متوفی ۶۲ھ) نے کہا: کیا تم میں سے کوئی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بھی زیادہ قابل اعتبار ہے؟ مسروق نے جواب میں کہا: نہیں، لیکن زید بن ثابت اور اہل مدینہ دادا اور بھائیوں کو میراث میں شریک کرتے ہیں''۔

شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں: ''اگر فقہاء مدینہ کسی بات پر متفق ہوں تو وہ لوگ اسے مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں، اسی طرح کے مسئلہ کے بارے میں امام مالک فرمایا کرتے ہیں: وہ سنت جس کے بارے میں ہمارے یہاں (مدینہ میں) کوئی اختلاف نہیں ہے یہ اور یہ ہے''۔

اگر فقہاء مدینہ میں اختلاف ہوتا ہے تو ان مختلف اقوال میں جو قول سب سے قوی اور راجح ہوتا ہے اسے اختیار کرتے ہیں قائلین کی کثرت کی وجہ سے یا قیاس کی موافقت کی وجہ سے یا کتاب وسنت سے تخریج کی وجہ سے، اسی طرح کے قول کے بارے میں امام مالک فرماتے ہیں: یہ میرے سنے ہوئے اقوال میں سب سے بہتر ہے، جب فقہاء صحابہ وتابعین سے حاصل

کئے ہوئے ذخیرۂ علم میں انھیں کسی مسئلہ کا جواب نہیں ملتا تو ان کے کلام سے مسئلہ کی تخریج کرتے ہیں اوران کے کلام کے اشارات واقتضاءات کا تتبع کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ آگے لکھتے ہیں: ''اس طبقہ کے دل میں تدوین کا خیال ڈالا گیا، چنانچہ امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) اور ابن ابی ذئب (متوفی ۱۵۸ھ) نے مدینہ منورہ میں، ابن جریج (متوفی ۱۵۰ھ) ابن عیینہ (متوفی ۱۹۶ھ) نے مکہ مکرمہ میں، سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) نے کوفہ میں، ربیع بن الصبیح (متوفی ۱۶۰ھ) نے بصرہ میں تدوین کا کام انجام دیا، اور کہتے ہیں: ان سب نے مذکورہ بالا منہج کو ہی اختیار کیا۔

ایک بار حج کے موقع پر خلیفہ منصور نے امام مالکؒ سے ملاقات کر کے عرض کیا: میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ آپ کی تصنیف کردہ کتابوں کے نسخے تیار کروا کر مسلمانوں کے ہر شہر میں اس کا ایک نسخہ بھیج دوں گا اور فرمان جاری کردوں گا کہ سب لوگ اسی کے مطابق عمل کریں، اسے چھوڑ کر کسی اور کی طرف تجاوز نہ کریں، تو امام مالکؒ نے منصور کی بات سن کر فرمایا: امیر المومنین! ایسا نہ کیجئے؛ کیونکہ لوگوں تک پہلے بہت سے اقوال پہنچ چکے ہیں، بہت سی احادیث وروایات سن چکے ہیں، اور لوگوں کے آنے جانے سے انہوں نے ان اقوال وروایات کو اختیار کرلیا ہے جو ان تک پہلے پہنچیں، ہر شہر والوں نے جو اقوال وروایات اختیار کرلی ہیں ان پر انھیں عمل پیرا رہنے دیجئے۔ یہ قصہ خلیفہ ہارون رشید کی طرف منسوب ہو کر بھی نقل کیا جاتا ہے کہ ہارون رشید نے چاہا تھا کہ سب لوگوں کو مؤطا کی روایات پر عمل کرنے پر آمادہ کرے تو امام مالکؒ نے فرمایا: ایسا نہ کیجئے؛ کیونکہ صحابہ کرام کے درمیان بہت سے فروع میں اختلاف ہوا اور صحابہ کرام مختلف شہروں میں پھیل گئے، اور ہر سنت پر عمل ہو چکا۔

شاہ ولی اللہؒ رقم طراز ہیں: ''امام مالکؒ مدینہ کے صحابہ کرام کی مرویات کے بارے میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور سند کے اعتبار سے سب سے زیادہ ثقہ تھے، اور وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں، عبداللہ بن عمرؓ اور ام المؤمنین عائشہؓ اور ان کے تلامذہ یعنی مدینہ کے فقہاء سبعہ

(سات فقہاء) کے اقوال سے سب سے زیادہ باخبر تھے۔ امام مالک اور انھیں جیسے لوگوں پر علم روایت اور فتوی کی عمارت قائم ہے۔

امام ابوحنیفہؒ حضرت ابراہیم نخعیؒ اور ان کے معاصر فقہاء کوفہ کے مذہب کو سب سے زیادہ مضبوطی سے پکڑنے والے تھے، امام صاحب فقہاء کوفہ کے مذہب سے شاذ ونادر ہی تجاوز کرتے، انھیں ابراہیم نخعی کے مذہب پر مسائل کی تخریج کرنے میں بڑا مقام حاصل تھا، تخریجات کے اسباب پر ان کی نظر بہت دقیق تھی، جزئیات کا پورا علم رکھتے تھے۔ اگر آپ کو میرے اس بیان کی حقیقت معلوم کرنی ہے تو امام محمدؒ کی کتاب الآثار، جامع عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ سے ابراہیم نخعی اور ان کے معاصر فقہاء کوفہ کے اقوال یکجا کر لیجئے، پھر ان کا امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے موازنہ کر لیجئے، آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ امام صاحب معدودے چند مسائل میں ہی ابراہیم نخعیؒ وغیرہ کی ڈگر سے ہٹے ہیں، ان چند مسائل میں بھی وہ فقہاء کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں گئے ہیں (۴۱)۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا مذکورہ بالا بیان محل نظر ہے؛ کیونکہ ان کا پورا زور اس بات پر ہے کہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ان دونوں کے تلامذہ اپنے سے پیشرو صحابہ وتابعین کے مقلد یا مثل مقلد تھے اور ان لوگوں نے متقدمین کی فقہ سے تجاوز نہیں کیا؛ لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی کی اس بات سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے؛ کیونکہ یہ چیز معروف ہے کہ فقہ کے کچھ طرق اور مناہج ایسے ہیں جنھیں ان دونوں حضرات (امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ) نے اختیار فرمایا، ان مناہج کے بارے میں یہ دعوی کرنا آسان نہیں ہے کہ وہ صحابہ وتابعین سے ماخوذ ہیں مثلاً امام مالک کا عمل اہل مدینہ کو اختیار کرنے کا اصول، امام ابوحنیفہؒ کا استحسان اور عرف کے اصول کو اختیار کرنا۔ اسی طرح ان دونوں ائمہ نے تابعین کے فتاوی سے استدلال نہیں کیا؛ بلکہ تابعین سے ان حضرات نے مزاحمت کی اور فرمایا: وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔ اسی طرح ان دونوں حضرات نے قبولیت احادیث کے لئے کچھ ایسی شرطیں لگائیں

جوان کے پیشروؤں کے یہاں موجود نہ تھیں۔

اس دور میں روایت کے رواج اور ایسی احادیث کے ظہور کی وجہ سے جو پہلے رواج پذیر نہ تھیں، ان حضرات نے بعض مسائل میں بعض صحابہ کے مذاہب کے مغائر مذاہب اختیار کئے۔

اہل الرائے اور اہل الحدیث:

شاید اس حقیقت کی زیادہ وضاحت اہل رائے کے اسکول اور اہل حدیث کے اسکول کے ظہور اور دونوں اسکولوں کے درمیان ابھر کر سامنے آنے والے اصولی اختلافات اور بعض فروعی اختلافات سے ہوتی ہے، یہ صحیح ہے کہ ان دونوں مکاتب فکر کی جڑیں عہد صحابہ وتابعین میں موجود تھیں لیکن مسائل فقہیہ میں ان دونوں اسکولوں کے اختلافات اس سے پہلے کسی دور میں اتنے نمایاں ہو کر کبھی سامنے نہیں آئے تھے، اسی طرح مناہج استنباط کی بنا پر دونوں اسکولوں کا امتیاز اسی دور میں واضح ہوا۔

تاریخ فقہ اسلامی کے مصنفین پورے وثوق سے یہ بات لکھتے ہیں کہ اہل الرائے کا فقہی اسکول دراصل عمر بن الخطابؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے فقہی اسکول کا امتداد ہے۔ یہ دونوں حضرات دیگر صحابہ کرام کے مقابلے رائے وقیاس میں بڑے متوسع تھے، ان دونوں حضرات سے علقمہ نخعی (متوفی ۶۰ھ یا ۷۰ھ) متاثر ہوئے، موصوف ابراہیم نخعی کے استاذ اور ماموں تھے، اور ابراہیم نخعی ہی کے شاگرد رشید حماد بن ابی سلیمان (متوفی ۱۲۰ھ) ہیں جو امام ابوحنیفہؒ کے شیخ ہیں۔

اسی طرح تاریخ فقہ اسلامی کے مورخین اس بات کو پوری قوت سے بیان کرتے ہیں کہ اہل الحدیث کا فقہی اسکول دراصل ان صحابہ کرام کے فقہی اسکول کا امتداد ہے جنھیں نصوص کی مخالفت کا خوف عام طور سے قیاس ورائے کے استعمال سے روکتا تھا مثلاً عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، زبیرؓ، عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ۔

''اہل الحدیث'' کا مذہب بہت سے اسباب کی وجہ سے حجاز میں پھیلا، ان میں سب سے نمایاں سبب یہ ہے کہ اہل حجاز کے پاس احادیث وآثار کی کثرت تھی، اور خلافت نیز بیشتر سیاسی سرگرمیوں کے شام پھر بغداد منتقل ہوجانے کی وجہ سے نئے مسائل (نوازل) بھی ان کے یہاں کم پیش آتے تھے۔ امام اہل مدینہ حضرت سعید بن المسیبؒ (متوفی ۹۴ھ) کا خیال یہ تھا کہ اہل حرمین سے حدیث وفقہ کی زیادہ مقدار فوت نہیں ہوئی ہے، اہل مدینہ کے پاس ابوبکر وعمر وعثمان اور خلافت سے پہلے علی رضی اللہ عنہم کے فتاوی تھے، اسی طرح ان کے پاس عائشہ، ابن عباس، ابن عمر، زید بن ثابت، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے فتاوی اور مرویات تھیں؛ اس لئے انھیں زیادہ رائے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اہل الرائے کا مذہب عراق میں پھیلا اور اس کی اشاعت ہوئی، اہل الرائے علماء کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ احکام شریعت عقلِ انسانی کے موافق ہیں، بندوں کے مصالح اور ان حکمتوں پر مشتمل ہیں جن کی وجہ سے وہ احکام مشروع ہوئے، اور اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ احکام شرعیہ کی ان حکمتوں اور مصلحتوں کو تلاش کریں اور احکام شریعت کو ان علتوں سے مربوط کریں، اور ان ہی علتوں پر احکام کے ہونے نہ ہونے کا مدار رکھیں۔ چنانچہ فقہاء اہل الرائے جب ان علتوں کا سراغ پاجاتے تب پھر ان علل پر مبنی قیاسوں کو معارضہ کی صورت میں احادیث کی بعض قسموں پر ترجیح دیتے۔

عراق میں اس منہج استنباط کے پھیلنے میں اس بات سے بھی مدد ملی کہ عراق میں بہت سے ایسے صحابہ کرام رہے جو حضرت عمرؓ کے طرز اجتہاد سے متاثر تھے مثلاً ابن مسعود، ابوموسی اشعری، عمران بن الحصین، انس بن مالک، ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ پھر خلافت کوفہ منتقل ہوئی اور حضرت علیؓ اور ان کے حامی صحابہؓ نے وہیں اقامت اختیار کرلی۔

جب عراق میں شیعہ اور خوارج کا ظہور ہوا، جنگیں برپا ہوئیں، اور وضع احادیث کا فتنہ پھیل گیا تو وہاں کے علماء قبول حدیث کے لئے شرطیں عائد کرنے پر مجبور ہوئے، ان شرطوں پر

عراق میں قیام پذیر صحابہ کرام کی کچھ روایتیں ہی پوری اتر سکیں، اس کے علاوہ عراق میں جو حوادث ونوازل کی کثرت تھی ان کا مقابلہ روایات کی اس تھوڑی تعداد سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس طرح جمہور امت جو خوارج اور شیعہ کے ہم عقیدہ نہیں تھی، ''اہل الحدیث'' اور ''اہل الرائے'' دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان برے القاب سے ایک دوسرے کو یاد کرنے کا مرض شدت اختیار کر گیا، ''اہل الرائے'' بسا اوقات ''اہل الحدیث'' کو عدم تفقہ اور قلت فہم کا طعنہ دیتے، اور ''اہل الحدیث'' ''اہل الرائے'' پر یہ الزام لگاتے کہ یہ لوگ دین کے بارے میں ظن کی پیروی کرتے ہیں، اور امورِ دین میں لازمی استحکام وتثبت سے کام نہیں لیتے؛ جبکہ یہ شریعت کی اتباع کامل اور نصوص کو اختیار کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

سچی بات یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے ساتھ ''اہل الرائے'' بھی اس بات سے متفق ہیں کہ جس کے سامنے سنت رسول واضح ہوچکی ہو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے قول کی وجہ سے سنت رسول کو ترک کردے۔ اہل الرائے پر جن مسائل میں مخالفتِ سنت کی قدغن لگائی گئی ہے ان مسائل میں ان کا عذر یہ ہے کہ یا تو انھیں حدیث پہنچی نہیں، یا حدیث پہنچنے کے باوجود راوی کے ضعیف ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس حدیث کو قابل اعتماد نہیں سمجھا، یا ان کے نزدیک کوئی مجروح کرنے والی بات اس حدیث میں موجود ہے جسے دوسرے لوگ قادح تصور نہیں کرتے، یا ان کے نزدیک کوئی دوسری حدیث پہلی حدیث کے معارض موجود اور ثابت ہے۔

اسی طرح ''اہل الحدیث'' ''اہل الرائے'' کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ جب کسی مسئلہ میں نص موجود نہ ہو تو قیاس ورائے کا سہارا لینا ضروری ہے، اس کے باوجود فریقین کے درمیان تیز وتند جملوں اور طنزوں کا تبادلہ ہوا کرتا تھا۔

چوتھی فصل
امام شافعیؒ کا ظہور

امام شافعیؒ کی پیدائش ۱۵۰ھ میں ہوئی، اسی سال امام ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی۔ انہوں نے ابتداءً مکہ کے بعض ''اہل الحدیث'' سے علم وتفقہ حاصل کیا مثلاً مسلم بن خالد زنجی (متوفی ۱۷۹ھ) اور سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ) سے، پھر امام دارالہجرہ پیشوائے اہل الحدیث امام مالک بن انس کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور ان سے موطأ روایت کی، امام شافعیؒ اپنے اوپر امام مالکؒ کے فضل واحسان کا اعتراف کرتے رہتے تھے۔ یونس بن عبدالاعلی کی روایت ہے کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جب علماء کا ذکر ہوتو مالک کی حیثیت تابندہ ستارے کی ہے، مجھ پر مالک بن انس سے زیادہ کسی کا احسان نہیں ہے'' (۴۲)۔ امام شافعیؒ نے لغت، شعروادب، بعض علوم ریاضیہ وطبیعیہ اور تاریخ کی تکمیل کے بعد امام مالکؒ کی شاگردی اختیار فرمائی تھی۔

امام شافعیؒ کو ''اہل الحدیث'' کے سارے اصول پسند نہیں آتے تھے، چنانچہ انہوں نے حدیث منقطع پر عمل کرنے پر تنقید فرمائی اور کہا: ''... منقطع کی کوئی حیثیت نہیں''، اسی طرح اہل الحدیث پر انہوں نے یہ بھی گرفت فرمائی کہ یہ لوگ حدیث مرسل پر مطلقاً عمل کرتے ہیں، انہوں نے صرف حضرت سعید بن المسیب کے مراسیل کو مستثنی کیا۔ بعض ''اہل الحدیث'' کا انہوں نے تزکیہ میں غیر ضروری تشدد برتنے پر مواخذہ کیا۔ اس کے بعد جب امام شافعیؒ ''اہل الرائے'' کے مرکز عراق پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اہل الرائے ''اہل مدینہ'' پر جن میں سرفہرست ان کے استاذ امام مالک ہیں زیادتی کرتے ہیں؛ چنانچہ وہ اپنے استاذ اور ان کے مذہب ومنہج کا دفاع کرنے کے لئے میدان میں آگئے، امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''مجھ

سے محمد بن الحسن نے کہا: میرے استاد ابوحنیفہ تمہارے استاد مالک بن انس سے زیادہ بڑے عالم ہیں، تمہارے استاد کے لئے بولنا مناسب نہیں اور میرے استاد کے لئے چپ رہنا مناسب نہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ سن کر مجھے غصہ آ گیا، میں نے کہا: میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں بتائیے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کا زیادہ علم مالک کو ہے یا ابوحنیفہ کو؟ انہوں نے جواب دیا: مالک کو، لیکن ہمارے استاد زیادہ قیاس کرنے والے ہیں، میں نے کہا: جی ہاں، اور امام مالک امام ابوحنیفہ سے زیادہ قرآن اور اس کے ناسخ ومنسوخ، نیز سنت رسول اللہ ﷺ کے جاننے والے ہیں، لہذا جس کا علم قرآن وسنت زیادہ ہے وہی بات کرنے کا زیادہ مستحق ہے'' (۴۳)۔

اس کے بعد امام شافعیؒ امام محمد بن الحسن اور دوسرے عراقی فقہاء کی کتابوں کے مطالعہ اور درس کی طرف متوجہ ہوئے اور امام محمد کی شاگردی اختیار کی، بسا اوقات ان پر رد کرتے اور سنت اور اہل الحدیث کی حمایت میں امام محمد کی آراء پر مناقشہ کرتے۔ پھر انہوں نے بغداد چھوڑ دیا، لیکن ۱۹۵ھ میں دوبارہ بغداد واپس آئے، اس وقت بغداد کی بڑی جامع مسجد میں چالیس یا پچاس سے کچھ زائد درس کے حلقے ہوتے تھے۔ امام شافعیؒ ہر حلقۂ درس میں جا کر مسائل پر بحث کرتے اور دلیل میں قرآن وسنت پیش فرماتے، اور اہل حلقہ صرف اپنے شیوخ واساتذہ کے اقوال پیش کرتے، آخر کار مسجد میں ان کے حلقہ درس کے سوا کوئی حلقہ باقی نہیں رہا (۴۴)۔

جماعت اہل الرائ کے بڑے بڑے افراد ان کے حلقہ درس میں آنے لگے مثلاً ابوثور، زعفرانی، کرابیسی وغیرہ، ان لوگوں نے اہل الرائے کا مذہب ترک کر کے امام شافعی کا مذہب اختیار کر لیا۔ ان کے حلقۂ درس کے خوشہ چینوں میں امام احمد بن حنبل بھی تھے، امام احمد نے ان کے بارے میں فرمایا: ''اصحاب الحدیث میں سے جس نے بھی قلم ودوات سنبھالا اس پر امام شافعیؒ کا احسان ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: اے ابومحمد! یہ کیسے؟ فرمایا: اصحاب الرائے اصحاب الحدیث کا مذاق اڑایا کرتے تھے یہاں تک کہ امام شافعیؒ نے اصحاب الحدیث کو آ کر سکھایا اور اہل الرائ کے خلاف حجت قائم کی'' (۴۵)۔

اہل الحدیث کے مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے امام شافعیؒ نے بغداد میں رہتے ہوئے

''کتاب الحجۃ'' تصنیف فرمائی؛ تا کہ اختلافی مسائل میں اہل الرائے کا رد کرسکیں (۴۶)۔

اس کے بعد امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو وہاں دیکھا کہ اکثر لوگ صحیح وسقیم میں تمیز کئے بغیر امام مالک کے تمام اقوال وآراء اختیار کئے ہوئے ہیں، لہذا انہوں نے امام مالکؒ کے اقوال پر ناقدانہ نظر ڈالی تو انہوں نے محسوس کیا کہ امام مالک بعض امور میں اصل کے قائل ہیں اور اس پر متفرع ہونے والی فرع کو چھوڑ دیتے ہیں، اور بعض جگہ فرع کے قائل ہیں اور اصل کو نہیں مانتے۔ اسی طرح امام شافعیؒ نے یہ بھی دیکھا کہ کہیں کہیں انہوں نے بعض صحیح احادیث کو ترک کر کے کسی صحابی یا کسی تابعی کا قول یا اپنا قیاس اختیار کرلیا ہے۔ کبھی امام مالکؒ صحابی کا قول نظر انداز کر کے کسی تابعی کی رائے وقیاس یا اپنی رائے وقیاس کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جزئیات، فروع اور تفصیلات میں قواعد واصول زیادہ ملحوظ نہیں ہیں، اور بہت سے مسائل میں وہ اجماع کا دعوی کرتے ہیں؛ حالانکہ وہ مسئلہ مختلف فیہ ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ نے یہ بھی محسوس کیا کہ امام مالکؒ کا اہل مدینہ کے اجماع کو حجت کہنا کمزور بات ہے، چنانچہ انہوں نے ''کتاب خلاف مالک والشافعی'' تصنیف فرمائی جس میں ان مسائل کا احاطہ کیا جن کے بارے میں اوپر اشارہ کیا گیا (۴۷)۔

امام شافعیؒ کی نظر میں امام مالکؒ نے ان مصالح مرسلہ کو ملحوظ رکھنے میں افراط سے کام لیا ہے جو شریعت کے شواہد پر مبنی نہیں ہیں، اور امام ابوحنیفہ نے اکثر مسائل میں قواعد واصول کو ملحوظ رکھے بغیر اپنی نگاہ جزئیات، فروع، تفصیلات تک محدود رکھی ہے (۴۸)۔

اس پورے پس منظر میں امام شافعیؒ نے محسوس کیا کہ قابل توجہ کاموں میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ استنباط فقہی کے اصول جمع کئے جائیں، اس کے قواعد کی شیرازہ بندی کی جائے، اور ان قواعد کو ایسے منہج بحث کی صورت میں ڈھال دیا جائے جس کے ذریعہ دلائل فقہ سے مسائل فقہیہ کا استنباط واستخراج کیا جاسکے، اور فقہ، قواعد فقہیہ کی عملی تطبیق ہوجائے؛ تا کہ اس طرح فقہ اہل الحدیث اور فقہ اہل الرائ کی جگہ ایک نئی فقہ تیار ہوجائے جس کے اصول وقواعد بھی فقہ کے ان دو قدیم اسکولوں سے علاحدہ ہوں۔ اسی جذبہ سے انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''الرسالہ'' تصنیف فرمائی، اور الرسالہ

میں جمع کردہ اصول وقواعد کو بنیاد بنا کر اپنے فقہ ومذہب کی تشکیل کی، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: امام شافعیؒ کی تشریف آوری سے پہلے ہم لوگ عموم وخصوص جانتے ہی نہیں تھے (۴۹)۔

امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سے فرمایا کرتے تھے: آپ حدیث اور رجال حدیث سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں، جب کوئی حدیث صحیح معلوم ہو تو مجھے بتائیے؛ خواہ وہ حدیث کوفہ، بصرہ یا شام کے راویوں کے واسطے سے پہنچی ہو، جب حدیث صحیح ہے تو میں اسے اختیار کروں گا'' (۵۰)۔

امام شافعیؒ کا مذکورہ بالا مقولہ صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ امام شافعی فروع وجزئیات سے کہیں زیادہ قواعد سازی کا اہتمام کرتے تھے۔

تاریخ اصول فقہ پر لکھنے والے اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ امام شافعی فن اصول فقہ کے پہلے مصنف ہیں، اور ''الرسالہ'' علم اصول فقہ کی پہلی تصنیف ہے (۵۱)۔

علامہ زرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) نے اپنی کتاب ''البحر المحیط'' میں اس بارے میں ایک فصل قائم کر کے لکھا ہے: ''امام شافعیؒ علم اصول فقہ کے پہلے مصنف ہیں، انہوں نے اس فن میں کتاب الرسالہ، کتاب احکام القرآن، اختلاف الحدیث، ابطال الاستحسان، کتاب جماع العلم، کتاب القیاس تصنیف کی۔ کتاب القیاس میں انہوں نے معتزلہ کو گمراہ قرار دیا اور معتزلہ کی شہادت قبول کرنے کے مسلک سے رجوع کیا۔ بعد میں علم اصول فقہ کے مصنفین نے انھیں کے نقش قدم کو اختیار کیا۔

جوینی نے الرسالہ کی شرح میں لکھا ہے: ''اصول اور علم اصول کی تصنیف میں کسی کو امام شافعیؒ پر سبقت حاصل نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے عام کی تخصیص کا اصول منقول ہے، بعض متقدمین سے مفہوم مخالف کا قائل ہونا مروی ہے، ان کے بعد کسی نے اصول کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی، اور نہ علم اصول میں ان کا کوئی حصہ ہے، اس لئے کہ ہم نے تابعین، تبع تابعین وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، ہم نے کسی کی اس فن میں کوئی تصنیف نہیں دیکھی (۵۲)۔

''الرسالہ'' میں امام شافعی کا منہج بحث:

امام شافعیؒ نے الرسالہ کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت کے

انسانوں کا حال ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت دو قسم کے انسان رہتے تھے :(۱) اہل کتاب، جنہوں نے کتاب الٰہی کے احکام میں تبدیلی اور تحریف کردی تھی، اور کفر کا ارتکاب کر کے ان لوگوں نے اپنے باطل خیالات کو خدا کے نازل کردہ حق کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا، (۲) کفار ومشرکین جنہوں نے اللہ کے علاوہ بتوں کو معبود بنا لیا تھا۔ اس کے بعد امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالی شانہ نے اپنے آخری رسول محمد ﷺ کو مبعوث فرما کر تمام لوگوں کو گمراہی سے نکالنا چاہا اور ان پر قرآن نازل فرمایا؛ تا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو کفر اور تاریکی کے غار سے نکال کر ہدایت اور نور کی وادی میں لائیں، ارشاد باری ہے:

"..... **وإنه لكتاب عزيز، لا يأتيه الباطل من بين يديه و لا من خلفه تنزيل من حكيم حميد**" (سورہ فصلت:۴۱۔۴۲) (.....اور یہ تو ایک عالی مرتبہ کتاب ہے، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہوسکتا ہے نہ پیچھے سے، دانا اور خوبیوں والے خدا کی طرف سے اتاری ہوئی ہے)۔

پھر تفصیل سے امام شافعیؒ نے اسلام میں قرآن کا مرتبہ ومقام بیان فرمایا اور لکھا کہ قرآن پاک میں حلال وحرام اور عبادات کا بیان ہے، اہل طاعت کے لئے جو ثواب تیار کیا گیا ہے اور اہل معصیت کے لئے جو سزائیں ہیں ان کا بیان ہے۔ گذرے ہوئے افراد اور اقوام کی خبریں ذکر کر کے بندوں کو خداوند نے نصیحت فرمائی ہے۔

اس کے بعد امام شافعیؒ نے ذکر فرمایا ہے کہ علم دین کے طالب کو قرآن عظیم کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کے لئے انتہائی جدوجہد کرنی چاہئے اور علم قرآن میں کمال حاصل کرنے کے لئے اخلاصِ نیت پیدا کرنا چاہئے۔

الرسالہ کے مقدمہ کے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں: "..... کسی مسلمان کو جو نئی صورت حال پیش آئے اس کے بارے میں راہ ہدایت کی رہنمائی قرآن پاک میں موجود ہے، ارشاد باری ہے:

"**الٓر، كتاب أنزلناه إليك لتخرج الناس من الظلمات إلى النور بإذن ربهم إلى صراط العزيز الحميد**" (سورہ ابراہیم:۱) ((یہ) ایک (پرنور) کتاب ہے، اس کو ہم

نے تم پر اس لئے نازل کیا کہ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ (یعنی) ان کے پروردگار کے حکم سے غالب اور قابل تعریف خدا کے راستے کی طرف)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"**.... وأنزلنا إليک الذکر لتبين للناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفکرون**" (النحل: ۴۴) (.....اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی تا کہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوتے ہیں انھیں آپ ظاہر کر دیں اور تا کہ وہ غور کریں)۔

اور اللہ تعالی نے فرمایا:

"**ونزلنا عليک الکتاب تبيانا لکل شيئ وهدى ورحمة وبشرى للمسلمين**" (النحل: ۸۹) (اور ہم نے آپ پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے)۔

ایک اور آیت میں قرآن پاک کے بارے میں آتا ہے:

"**وکذلک أوحينا إليک روحا من أمرنا ماکنت تدری ما الکتاب ولا الإيمان ولکن جعلناه نوراً نهدی به من نشاء من عبادنا وإنک لتهدی إلى صراط مستقيم، صراط الله ....**" (الشوری: ۵۲۔۵۳) (اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف روح القدس کے ذریعہ سے (قرآن) بھیجا ہے نہ آپ کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو، لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک (اے محمدؐ) آپ سیدھا راستہ دکھاتے ہیں، اللہ کا راستہ.....)۔

اس کے بعد امام شافعیؒ نے بیان قرآنی کے بارے میں ایک باب قائم کیا ہے۔ بیان کی تعریف کرنے کے بعد انہوں نے قرآن کریم میں وارد احکام کے سلسلہ میں بیان کے مراتب کی وضاحت کی ہے، اور یہ مراتب پانچ ہیں:

پہلی قسم: جو احکام اللہ تعالی نے قرآن میں اتنے واضح الفاظ میں بیان کئے ہیں جن میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ بیان کی یہ قسم اپنی وضاحت کے لئے قرآن کے سوا کسی اور چیز کا

محتاج نہیں ہے۔

دوسری قسم: جس حکم کو قرآن نے ایسے الفاظ میں بیان کیا جن میں متعدد معانی کا احتمال ہے؛لیکن حدیث نبوی نے مختلف معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کردی۔

تیسری قسم: قرآن نے کسی چیز کی فرضیت کے سلسلہ میں انتہائی وضاحت سے بیان کردیا ہواور نبی اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی ہو کہ اس فرض کو کس طرح ادا کریں گے، کن لوگوں پر فرض ہے، کب فرضیت ختم ہوتی ہے اور کب باقی رہتی ہے۔

چوتھی قسم: جس مسئلہ کے بارے میں قرآن میں کوئی نص نہیں ہے اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے کوئی حکم دیا اور قرآن میں اللہ تعالی نے رسول کی اطاعت اور ان کا حکم ماننا فرض قرار دیا ہے، لہذا رسول کی طرف سے فرضیت دراصل اللہ تعالی کی طرف سے فرضیت ہے۔

پانچویں قسم: جن مسائل کے حل کے بارے میں اللہ تعالی نے اپنی مخلوق پر اجتہاد فرض کیا ہے، تو یہی قیاس ہے، اور امام شافعی کے نزدیک قیاس وہ حکم ہے جو کتاب وسنت کے منصوص احکام کی روشنی میں دلائل کی بنیاد پر لگایا جائے۔

بیان کے پانچوں مراتب اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد انہوں نے ہر قسم کی وضاحت کی ہے اور اس کی مثالیں اور شواہد پیش کئے ہیں، پھر انہوں نے الرسالہ کو مندرجہ ذیل ابواب پر مرتب کیا ہے:

۱۔ پہلا باب ان احکام کے بیان میں جو کتاب اللہ میں عام وارد ہیں، جن سے عام مراد لیا جاتا ہے اور ان میں خصوص داخل ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا باب ان احکام کے بیان میں جو ظاہر کے اعتبار سے قرآن میں عموم کے ساتھ وارد ہوئے ہیں لیکن وہ عام خاص دونوں کو شامل ہیں۔

۳۔ جو احکام قرآن میں بہ ظاہر عموم کے ساتھ نازل ہوئے لیکن ان سے کلی خاص مراد ہوتا ہے۔

۴۔ وہ احکام جن کے مراد کی وضاحت سیاق کلام سے ہوتی ہے۔

۵۔ وہ احکام جن کے الفاظ ان کے باطنی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں ظاہری مفہوم پر نہیں۔

۶۔ جو احکام عموم کے ساتھ نازل ہوئے لیکن حدیث رسول سے معلوم ہوا کہ اس سے خاص مراد ہے، اس باب میں مصنف نے سنت کی حجیت اور دین میں اس کے مقام پر بھی کلام کیا ہے، اسی لئے اس باب کے فوراً بعد مندرجہ ذیل ابواب قائم کئے ہیں:

(۱) اس بات کا بیان کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں اپنے نبی کے طریقے کی اتباع لازم قرار دی ہے۔

(۲) اس بات کا بیان کہ اللہ تعالی نے اپنی طاعت کی فرضیت بیان کرنے کے ساتھ رسول اللہ کی اطاعت کی فرضیت بھی بیان کی ہے اور علاحدہ بھی اطاعتِ رسول کی فرضیت بیان فرمائی ہے۔

(۳) اس بات کا بیان کہ اللہ تعالی نے اطاعتِ رسول کا حکم فرمایا ہے۔

(۴) اس بات کا بیان کہ اللہ تعالی نے اپنی مخلوقات پر واضح فرمایا ہے کہ رسول کے لئے اللہ کی وحی کی اتباع فرض ہے، اسی طرح رسول کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی اتباع رسول پر اور ہدایت یافتہ لوگوں پر لازم ہے، اور اللہ ہی اس کو ہدایت دینے والا ہے جو اس کی اتباع کرے۔

اس باب میں امام شافعیؒ نے اس بات پر زور دیا کہ کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بھی مستقلاً بعض احکام دیئے، اور جس مسئلہ میں متعین طور پر کتاب اللہ کی آیت موجود نہیں اس کے بارے میں حکم شریعت بیان کیا۔ امام شافعیؒ نے اس بات میں کتاب اللہ سے علاحدہ سنت رسول کی مستقل حجیت ثابت کی ہے اور سنت کو دلیل مستقل نہ ماننے والوں پر حجت قائم کی ہے پھر تحریر فرمایا ہے: ''... ہم نے سنت رسول کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں یعنی کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اور قرآن میں غیر مذکور مسائل کے بارے میں سنت رسول، ہم دونوں قسموں کے سلسلہ میں کچھ باتیں اور مثالیں ان شاء اللہ پیش کریں گے''۔

''کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول کے ذیل میں پہلی بات ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ سنت رسول سے کتاب اللہ کی ناسخ و منسوخ آیتوں کا علم ہوتا ہے۔

پھر قرآن میں مذکور ان فرائض کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں رسول نے بھی کچھ ہدایات دی ہیں، پھر قرآن کے ان مجمل فرائض کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالی کی طرف سے وضاحت فرمائی کہ ان فرائض کی تفصیلات کیا ہیں، اوقات کیا ہیں۔ پھر قرآن کے اس عام امر کا ذکر کیا ہے جس سے عام ہی مراد ہے اور اس امر عام کا ذکر کیا ہے جس سے خاص مراد ہے۔ پھر اس سنت کا ذکر کیا ہے جو قرآن میں غیر مذکور مسائل کے بارے میں ہے''۔

اس کے بعد انہوں نے ایک فصل ''ابتداء ناسخ ومنسوخ'' کے بارے میں قائم کر کے لکھا ہے کہ اللہ تعالی نے نسخ احکام، کشادگی اور تخفیف کے لئے رکھا ہے۔ پھر ذکر فرمایا ہے کہ قرآن کا نسخ قرآن سے ہوتا ہے اور سنت کا سنت سے۔

پھر ان ناسخ ومنسوخ احکام کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کا علم قرآن سے ہوا ہے اور بعض کا سنت سے۔

ایک باب نماز کی فرضیت کے بارے میں قائم کیا ہے جس پر قرآن نے دلالت کی ہے، پھر سنت رسول نے وضاحت کی کہ کن لوگوں سے نماز کی فرضیت عذر کی بنا پر ختم ہو جاتی ہے اور کن لوگوں کی نماز گناہ کی وجہ سے لکھی نہیں جاتی۔

اسی طرح ایک باب اس ناسخ ومنسوخ کے بارے میں قائم کیا ہے جس پر سنت رسول اور اجماع امت دلالت کرتا ہے۔

پھر ان فرائض سے متعلق گفتگو کی ہے جو قرآن میں کسی خاص باب سے متعلق آئی ہیں۔ پھر ان منصوص فرائض پر گفتگو کی ہے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بھی احکام وہدایات دی ہیں۔ اس کے بعد قرآن میں مذکور اس فرض پر کلام کیا ہے جس کے بارے میں سنت نے دلالت کی ہے کہ اس سے خاص مراد ہے۔ پھر ان اجمالی فرائض پر بحث کی ہے جن کی فرضیت قرآن نے محکم انداز میں بیان کی ہے اور انھیں ادا کرنے کا تفصیلی طریقہ زبان نبوت

سے بیان کرایا گیا ہے، اس ذیل میں امام شافعیؒ نے نماز، زکوۃ، حج، بیویوں کی تعداد، محرم عورتوں (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے)، اور حرام کھانوں کا ذکر کیا ہے۔

پھر امام شافعیؒ نے ''علل احادیث'' کے بارے میں ایک باب قائم کیا ہے، اس باب میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ احادیث میں اختلاف کے متعدد اسباب ہوتے ہیں، جن میں سے بعض اسباب پر امام شافعیؒ نے گفتگو کی ہے مثلاً نسخ کی وجہ سے اختلاف، اور احادیث میں غلطی کی وجہ سے اختلاف، امام صاحب نے حدیث میں غلطی کے بعض اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح احادیث میں اختلاف کے دوسرے بہت سے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔

اس کے بعد امام شافعیؒ نے نہی کے ابواب واقسام پر بحث کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ احادیث نبویہ ایک دوسرے کی وضاحت کرتی ہیں۔

پھر ''علم'' کے بارے میں ایک باب قائم کر کے بتایا ہے کہ علم دین کی دو قسمیں ہیں :

(۱) علم عام جس سے ناواقف ہونے کی کسی عاقل بالغ مسلمان کے لئے گنجائش نہیں، اور تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے کہ علم کی یہ قسم پوری کی پوری صراحتاً قرآن پاک میں موجود ہے، اور اس کی تفصیلات عام طور پر جمہور مسلمین کے پاس موجود ہیں۔ اس علم کو مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے سیکھتی چلی آئی ہے، اسی طرح یہ سلسلہ نبی اکرم ﷺ تک پہنچتا ہے، اس کے نقل کرنے اور اس کے وجوب میں امت میں کوئی اختلاف نہیں، اس علم عام میں نقل اور تاویل کسی راہ سے بھی غلطی کا امکان نہیں۔

(۲) علم دین کی دوسری قسم فرائض کے ان فروع اور دوسرے احکام پر مشتمل ہے جن کے بارے میں کتاب اللہ کی کوئی نص نہیں آئی ہے، اور نہ ہی ان میں سے اکثر کے بارے میں اخبار خاصہ ''یعنی خبر واحد'' کے سوا کوئی منصوص سنت آئی ہے۔ اس باب کے ذریعہ انہوں نے دراصل آگے والی دو بحثوں کی تمہید قائم کی ہے، وہ دونوں بحثیں یہ ہیں:

خبر واحد کا باب، اس باب میں انہوں نے خبر واحد کی تعریف اور اس کی شرطیں ذکر کی

ہیں، اس کے بعد شہادت وروایت کا فرق بیان کیا ہے، اور ذکر کیا ہے کہ خبر واحد کن امور میں قبول کی جائے گی اور کن امور میں تنہا خبر واحد کافی نہیں، پھر امام شافعی نے خبر واحد کی حجیت اور اس سے استدلال کی صحت پر گفتگو کی ہے، اور خبر واحد کی حجیت کا انکار کرنے والوں کے تمام شبہات کا خالص استدلالی انداز میں پوری قوت کے ساتھ رد لکھا ہے۔

پھر باب ''اجماع'' کی طرف منتقل ہوئے ہیں جس میں انہوں نے اجماع کی حقیقت اور حجیت پر بحث کی ہے۔

اس کے بعد ''قیاس'' پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے قیاس کے معنی، ماہیت، ضرورت اور قیاس کے اقسام سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ قیاس کرنا کس کے لئے درست ہے اور کس کے لئے درست نہیں۔

اس کے بعد ''اجتہاد'' کے بارے میں ایک باب قائم کیا ہے، اس میں کتاب وسنت سے اجتہاد کی اصل بیان کی ہے، پھر اجتہاد میں غلطی اور درستگی پر گفتگو کی ہے۔ پھر ''استحسان'' پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے واضح فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے درست نہیں کہ حدیث کے خلاف کسی چیز کو پسند کرے، اور اس بات پر زور دیا ہے کہ کسی کے لئے اس کا جواز نہیں کہ کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کے بغیر کوئی حکم شرعی ثابت کرے، قیاس اور استحسان کا فرق بھی واضح کیا ہے۔

اس کے بعد اہل علم کے اختلاف کے بارے میں ایک باب قائم کرکے واضح کیا ہے کہ اس اختلاف کی دو قسمیں ہیں: (۱) اختلاف حرام (۲) اختلاف جائز۔

اختلاف حرام وہ اختلاف ہے جس کے بارے میں اللہ تعالی نے قرآن پاک میں یا زبان نبوت سے حجت قائم کردی ہے، اور اختلاف جائز ان مسائل میں اختلاف کا نام ہے جو قابل تاویل ہیں اور قیاس سے ان کا علم ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے مذکورہ دونوں قسموں پر استدلال کیا ہے، اختلاف جائز کی مثالیں دی ہیں اور اس اختلاف کے بعض اسباب ذکر کئے ہیں، بہ

طور نمونہ چند ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جن میں فقہاء صحابہ کے درمیان اختلاف تھا مثلاً عدت، ایلاء، میراث۔

اس باب میں امام شافعیؒ نے کسی مسئلہ میں صحابہ کرام کے مختلف اقوال پائے جانے کی صورت میں اپنا اصولی موقف واضح کیا ہے۔

الرسالہ کے بالکل آخری حصہ میں انہوں نے ادلہ شرعیہ (کتاب، سنت، اجماع، قیاس) کے مراتب پر اپنا مسلک بیان کیا ہے، اس ذیل میں انہوں نے لکھا ہے: ''.... ہم کتاب اللہ اور متفق علیہ سنت (جس کے بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں) کی بنیاد پر حکم لگاتے ہیں، پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم نے ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے درست حکم لگایا ہے۔ اور جو سنت انفرادی طور پر مروی ہے اور اس پر امت کا اتفاق نہیں ہے اگر ہم اس کی بنا پر حکم لگاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بہ ظاہر درست حکم لگایا ہے؛ کیونکہ کبھی کبھی حدیث کی روایت کرنے والے سے غلطی پوشیدہ رہ جاتی ہے۔ اور ہم اجماع پھر قیاس کی بنا پر حکم لگاتے ہیں، قیاس سے حکم لگانا اجماع پر مبنی حکم سے بھی کمزور ہے، لیکن قیاس کو ضرورۃً دلیل شرعی کا مقام دیا گیا ہے؛ کیونکہ حدیث کی موجودگی میں قیاس جائز نہیں''۔

امام شافعیؒ نے الرسالہ میں جو بحثیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کے زمانے میں متفق علیہ اصول کیا تھے اور مختلف فیہ اصول کیا تھے۔

متفق علیہ اصول یہ تھے: (۱) قرآن پاک (۲) فی الجملہ سنت نبوی۔

مختلف فیہ اصولوں میں بعض لوگوں کے نزدیک تمام سنت مختلف فیہ تھی، بعض لوگ محض خبر واحد کی حجیت سے اختلاف کرتے تھے جسے امام شافعیؒ نے خبر خاصہ کا نام دیا ہے۔ ''الرسالہ'' اور ''جماع العلم'' وغیرہ میں امام شافعی نے ان دونوں مذاہب کی بھرپور تردید کی ہے اور ایسی مکمل بحث کی ہے جس سے زیادہ بحث نہیں کی جاسکتی۔

(۱) اجماع اور اس کی حجیت میں بھی اختلاف تھا، اس کی بعض قسموں کے بارے میں

اختلاف تھا، اور یہ باتیں بھی اختلافی تھیں کہ کن لوگوں کا اجماع حجت ہے اور کن امور میں حجت ہے، اسی طرح اجماع کے انعقاد کے وقت اس کے علم کا بھی امکان ہے یا نہیں اس میں بھی اختلاف تھا۔

(۲) اسی طرح قیاس واستحسان کے بارے میں کئی طرح کے اختلافات تھے۔ دونوں کے مفہوم، حقیقت، حجیت، طریقہ اور امکان عمل کے بارے میں اختلاف تھا۔ صحابہ کے جو اعمال واجتہادات قیاس واستحسان کی مثالیں بن سکتے تھے ان کے بارے میں اختلاف تھا۔

(۳) ''امر ونہی'' کے مفہوم اور دلالت اور احکام فقہیہ پر ان دونوں کے اثرات کے بارے میں واضح اختلافات تھے۔ اس مقام پر یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ائمہ اربعہ کے اس عصر میں متعین اصطلاحات (مثلاً تحریم، ایجاب وغیرہ) کا استعمال ان کی لغات اور تعبیرات میں مروج نہیں ہوا تھا، بلکہ ابن القیم کے بیان کے مطابق یہ اصطلاحات بعد میں وجود میں آئیں (۵۳)۔

(۴) اصول فقہ کے مصنفین مختلف فیہ ادلہ کے ضمن میں دوسرے جن اصولوں کا ذکر کرتے ہیں مثلاً عرف وعادت اور استصحاب وغیرہ، ان کا استعمال بھی ان ائمہ کے دور میں ان کی تعبیرات میں نمایاں طور پر نہیں ملتا۔

پانچویں فصل
علم اصول فقہ امام شافعیؒ کے بعد

امام شافعی کی کتاب ''الرسالہ'' ظہور پذیر ہوتے ہی اصولی تحقیقات اور بحثوں پر چھا گئی۔ الرسالہ کے بارے میں علماء دو گروہ میں تقسیم ہو گئے: ایک گروہ نے اسے قبول کیا اور اسے اپنے مذہب کے بارے میں دلائل کی بنیاد قرار دیا، یہ جمہور اہل الحدیث تھے، اور ایک گروہ نے الرسالہ کے بیشتر مضامین کو مسترد کر دیا اور اس بات کا احساس کیا کہ الرسالہ سے لوگوں کے متاثر ہونے سے پہلے ہی مذہب کے مخالف اصول ونظریات کی تردید ان کی ذمہ داری ہے۔ جمہور اہل الرائ اور الرسالہ میں ذکر کردہ اصول ونظریات کے مخالفین کا یہی رویہ تھا۔

ابن الندیم نے اصول فقہ کے موضوع پر الرسالہ کے بعد لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے؛ چنانچہ ابن الندیم نے امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۳۳ھ) کی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' اور ''کتاب السنہ'' کا ذکر کیا ہے، لیکن کتاب السنہ کتب اصول سے زیادہ توحید وعقائد کی کتابوں سے قریب تر ہے، مکہ مکرمہ میں ۱۳۴۹ھ میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ کتاب السنہ دو ترتیبوں کے ساتھ آئی ہے:

(۱) کتاب السنۃ کبری، اسی کتاب کا ذکر چل رہا ہے، دار الکتب المصریہ اور ظاہریہ میں اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ قاہرہ سے بھی یہ کتاب شائع ہوئی ہے لیکن اس میں اشاعت کی تاریخ نہیں ہے۔

(۲) کتاب السنۃ صغری، اس کتاب میں اہل سنت کے عقائد کا بیان ہے۔ تاریخ اشاعت کی صراحت کے بغیر یہ کتاب بھی قاہرہ سے چھپ گئی ہے۔ امام احمدؒ کی ایک تصنیف

''طاعۃ الرسول'' بھی ہے،جس کے اقتباسات ابن القیم نے اعلام الموقعین میں نقل کئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن القیمؒ کے پاس اس کتاب کا نسخہ تھا۔ہم نے یہ کتاب بہت سی جگہوں میں تلاش کی لیکن کوئی سراغ نہ لگ سکا۔ابن القیم کے نقل کردہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنت کے مباحث میں بڑی اہم اصولی کتاب ہے،شاید ابن القیم کے دور کے بعد یہ کتاب ناپید ہوگئی، یا تجلید کے وقت کسی دوسری کتاب کے ساتھ ضم ہوگئی، یا اس کا پہلا ورق ضائع ہوگیا،اس لئے تلاش وتتبع اور استقراء کے بغیر اس کا سراغ لگنا ممکن نہیں رہا۔

تاریخی مصادر میں داؤد ظاہری (متوفی ۲۷۰ھ) کی طرف مندرجہ ذیل اصولی کتابیں منسوب کی گئی ہیں :(۱) کتاب الاجماع (۲) ابطال التقلید (۳) خبر الواحد (۴) الخبر الموجب (۵) الخصوص والعموم (۶) المفسر والمجمل (۷) الکافی فی مقابلۃ المطلبی یعنی الشافعی (۸) کتاب مسألتین خالف فیہما الشافعی (۵۴)۔

اس عرصہ میں علماء احناف نے الرسالہ کا مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے جاری رکھا کہ الرسالہ میں جو اصول وقواعد ان کے خلاف ہیں ان کی تردید کریں، اور مسائل جزئیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے فتاوی سے اصول فقہ حنفی کا استخراج کریں۔

چنانچہ عیسی بن ابان (متوفی ۲۲۰ھ) نے اصول پر یہ کتابیں لکھیں :(۱) کتاب خبر الواحد (۲) کتاب اثبات القیاس (۳) اجتہاد الرائے۔ البرزعی (متوفی ۳۱۷ھ) نے ایک کتاب ''مسائل الخلاف'' کے نام سے لکھی،اس کا ایک نسخہ تونس کے کتب خانہ الزیتونہ میں ہے، کتاب کے اوراق (۲۳۶) اور اس کا نمبر (۱۶۱۹) ہے۔ ابوجعفر طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) نے ''اختلاف الفقہاء'' لکھی،اس کا اختصار جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) نے کیا،اس کا ایک نسخہ قاہرہ میں موجود ہے، اس نسخے کا تعارف حاصل کرنے کے لئے فہرس معہد المخطوطات (۳۲۹/۱) کا مطالعہ کیجئے۔

کرابیسی نجفی (متوفی ۳۲۲ھ) نے کتاب ''الفروق'' لکھی،اس کا ایک ایک قلمی نسخہ

استنبول کے مکتبہ احمد الثالث اور مکتبہ فیض اللہ میں موجود ہے۔

ابن سماعہ (متوفی ۲۳۳ھ) کی طرف چند اصولی کتابیں منسوب کی گئی ہیں، ان کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے (۵۵)۔ کنانی (متوفی ۲۸۹ھ) نے ''الحجۃ فی الرد علی الشافعی'' تصنیف کی، اسی طرح علی بن موسی قمی حنفی (متوفی ۳۰۵ھ) نے یہ کتابیں تصنیف کیں : (۱) ما خالف فیہ الشافعی العراقیین فی احکام القرآن (۲) اثبات القیاس (۳) الاجتہاد (۴) خبر الواحد۔

امام کرخیؒ (متوفی ۳۴۰ھ) نے اپنا مشہور رسالہ ''اصول الکرخی'' تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ بھی قاہرہ سے ایک مجموعہ رسائل کا جز بن کر شائع ہو چکا ہے، سن اشاعت کی صراحت نہیں ہے۔

فرقہ امامیہ کے ایک عالم ابوسہل نوبختی (متوفی ۳۱۱ھ) نے اصول فقہ پر یہ کتابیں لکھیں : (۱) نقض رسالۃ الشافعی (۲) ابطال القیاس (۳) الرد علی ابن الراوندی فی بعض آراءہ الاصولیہ۔

اسی طرح ابن الجنید زیدی (متوفی ۳۴۷ھ) نے اصول پر یہ دو کتابیں لکھیں : (۱) الفسخ علی من أجاز النسخ لما تم شرعہ وجل نفعہ (۲) الافہام لأصول الاحکام۔

علماء شافعیہ میں سے ابوثور (متوفی ۲۴۰ھ) نے ایک کتاب ''اختلاف الفقہاء'' کے نام سے لکھی، ابوعبداللہ محمد بن نصر مروزی (متوفی ۲۹۴ھ) کی بھی ''اختلاف الفقہاء'' کے نام سے ایک کتاب ہے۔ ابوالعباس بن سریج (متوفی ۳۰۵ھ) نے عیسی بن ابان کی تردید میں ایک کتاب لکھی، اور ابوالعباس بن سریج سے محمد بن داؤد ظاہری نے ان مسائل کے بارے میں مناظرہ کیا جن میں ظاہریہ کا مسلک امام شافعیؒ کے مسلک کے خلاف ہے۔ ابراہیم بن احمد مروزی (متوفی ۳۴۰ھ) نے یہ دو کتابیں لکھیں: (۱) العموم والخصوص (۲) الفصول فی معرفۃ الاصول (۵۶)۔

بعض علماء شافعیہ نے ''الرسالہ'' کی شرح لکھی، چنانچہ ابوبکر صیرفی (متوفی ۳۳۰ھ)،

ابوالولید نیساپوری (متوفی ۳۶۵ یا ۳۶۳ھ)، ابوبکر جوزقی (متوفی ۳۸۸ھ)، ابومحمد الجوینی (امام الحرمین کے والد) نے الرسالہ کی شرحیں لکھیں۔ ان کے علاوہ پانچ دوسرے علماء کی جانب بھی الرسالہ کی شرحیں منسوب ہیں، وہ علماء یہ ہیں : (۱) ابوزید جزولی (۲) یوسف بن عمر (۳) جمال الدین الفقہسی (۴) ابن الفاکہانی (۵) ابوالقاسم عیسی بن ناجی۔ الرسالہ کی یہ شرحیں جن میں سے بعض شرحوں سے ساتویں صدی ہجری کے بعد تک کے علماء اقتباسات نقل کرتے رہے، ان میں سے کوئی شرح اب تک ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ شیخ مصطفی عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے (۵۷) کہ پیرس کے المکتبۃ الاہلیہ (نیشنل لائبریری) میں جوینی کی شرح الرسالہ کا ایک نسخہ محفوظ ہے، موصوف نے اس سے بعض اقتباسات بھی نقل کئے ہیں۔ ہم نے المکتبۃ الاہلیہ میں اس کا سراغ لگانا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی، شاید اسے کسی دوسرے فن کی کتابوں میں رکھ دیا گیا ہو یا کسی دوسرے نام سے اس کا اندراج ہو؛ لہذا اسے تلاش کرنے کے لئے تمام محفوظ مخطوطات کی ورق گردانی ضروری ہوگی، جس کا موقع شاذ ونادر ہی میسر آتا ہے۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ تحقیقی کام کرنے والا کافی زمانہ کتب خانہ میں گذارے۔

امام شافعیؒ کے بعد علم اصول فقہ کا ارتقاء:

اصول فقہ کے بارے میں مذکورہ بالا کوششوں کو اس علم کا حقیقی ارتقاء قرار دینا دشوار ہے؛ اس لئے کہ یہ کوششیں تقریباً تمام کی تمام الرسالہ کے اردگرد ہی گھومتی ہیں، یعنی الرسالہ کی تردید یا تائید یا اس کی شرح، پانچویں صدی ہجری سے پہلے یہی صورت حال رہی۔ پانچویں صدی ہجری میں وہ کوششیں سامنے آئیں جنھیں ہم اصول فقہ کی جمع وتدوین کے بعد اصول فقہ کا ارتقاء تصور کرسکتے ہیں۔

اسی دور میں قاضی باقلانی (متوفی ۴۰۳ھ) اور قاضی عبدالجبار ہمدانی (متوفی ۴۱۵ھ) تمام اصولی موضوعات پر ازسرنو تصنیف وتالیف کے لئے سامنے آئے، زرکشی اپنی کتاب البحر میں لکھتے ہیں: یہاں تک کہ دونوں قاضیوں کا دور آیا۔ اہل سنت کے قاضی ابوبکر

طیب اور معتزلہ کے قاضی عبد الجبار، تو ان دونوں نے عبارتوں میں شرح و بسط سے کام لیا، اشاروں کو واضح کیا، اجمال کی تفصیل کی، اور اشکالات کو دور کئے۔

اسی لئے قاضی باقلانی ''التقریب والارشاد'' تصنیف کرنے کے بعد ''شیخ الاصولیین'' کا لقب پانے کے مستحق قرار پائے (۵۸)، اس کتاب کا اب تک سراغ نہیں لگا ہے، شاید مخطوطات کے کسی کتب خانے میں دستیاب ہوجائے، علماء اصول نویں صدی ہجری تک اس کتاب سے اقوال و اقتباسات نقل کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح قاضی عبد الجبار معتزلی اپنی کتاب ''العہد'' یا ''العمد'' اور اس کی شرح لکھی۔ امام الحرمین (متوفی ۴۷۸ھ) نے قاضی باقلانی کی کتاب ''التقریب والارشاد'' کا اختصار ''التلخیص'' یا ''الملخص'' کے نام سے تیار کیا، مخطوطات کے بعض کتب خانوں میں اس تلخیص کے کچھ اوراق محفوظ ہیں۔ بعد کے اہل اصول نے امام الحرمین کی تلخیص سے قاضی باقلانی کی بعض آراء نقل کی ہیں۔

اسی طرح امام الحرمین نے قاضی باقلانی کے طرز پر ''البرہان'' تصنیف کی۔ قاضی باقلانی کی طرح امام الحرمین کی ''البرہان'' بھی تمام اصولی مباحث کو شامل ہے، لیکن ان کے منہج کی پابندی نہیں کی اور دلیل کے اعتبار سے باوزن قول کو اختیار کیا ہے۔ امام الحرمین نے اشعری اور شافعی ہونے کے باوجود چونکہ امام شافعی اور امام ابوالحسن اشعری کی بہت سی آراء سے اختلاف کیا ہے اس لئے امام الحرمین کے شافعی شاگرد ''البرہان'' کی شرح لکھنے سے کتراتے تھے اور اس کتاب پر اتنی توجہ نہیں کرتے تھے جس کی یہ کتاب مستحق تھی؛ حالانکہ شافعیہ کی کتابوں میں البرہان سے بہ کثرت نقلیں پائی جاتی ہیں۔ دو مالکی علماء نے ''البرہان'' کی شرحیں لکھیں: (۱) امام ابوعبد اللہ مازری (متوفی ۵۳۶ھ) (۲) ابوالحسن الابیاری (متوفی ۶۱۶ھ)، پھر ان دونوں شرحوں کو تیسرے مالکی عالم ابویحییٰ نے یکجا کیا۔ ان سب نے امام الحرمین پر زیادتی کی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ امام ابوالحسن اشعری کی بعض

مسائل میں بڑی جرأت سے تردید کرتے ہیں اور امام مالکؒ پر ''مصالح مرسلہ'' کے مسئلہ میں رد کرتے ہیں (۵۹)۔

امام الحرمین کی کتاب میں ایسے تمہیدی مقدمات ہیں جن میں سے اکثر ''الرسالہ'' میں مذکور نہیں ہیں۔ انہوں نے گفتگو یہاں سے شروع کی ہے کہ کسی علم کی تحصیل کرنے والے کے لئے ابتداءً اس علم کے مآخذ اور تعریف کا جاننا ضروری ہے۔ انہوں نے واضح فرمایا کہ اصول فقہ کے مآخذ علم کلام، علم عربیت اور علم فقہ ہیں، پھر انہوں نے احکام شرعیہ، اور انسان کا ان احکام کا مکلف ہونا، اہلیت اور اس کے عوارض پر گفتگو کی ہے، اس کے بعد مدارک علوم پر تفصیلی کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ کن اشیاء کا ادراک عقل کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اور پھر علم دین کے مدارک بیان فرمائے۔ یہ سب بحثیں مباحث ''بیان'' کی تمہید کے طور پر تھیں جن سے امام شافعیؒ نے الرسالہ کا آغاز کیا تھا۔

''بیان'' اور اس کے بعد الرسالہ میں مذکور دوسرے موضوعات کی طرف منتقل ہوتے وقت انہوں نے امام شافعیؒ سے زیادہ باریک اور جامعیت سے ''بیان'' کی تعریف کی ہے؛ چنانچہ امام الحرمین نے بیان کی حقیقت، اس کے سلسلہ میں اختلاف، بیان کے مراتب، اور ایسے کئی مسائل کی وضاحت کی جن پر امام شافعیؒ توجہ نہیں دے سکے تھے۔ ان میں سے ایک حاجت کے وقت تک بیان کو مؤخر کرنے (تاخیر البیان إلی وقت الحاجۃ) کا مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن ''مراتب بیان'' پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے امام شافعی کے ذکر کردہ پانچوں مراتب نقل کر دیئے ہیں، اور ابوبکر بن داؤد ظاہری نے اس پر جو اعتراض کیا ہے اس کی تائید امام الحرمین نے کی ہے، پھر دیگر فقہاء کے نزدیک ''مراتب بیان'' کا تذکرہ کیا ہے، اور اس بات کو اختیار کیا ہے کہ ان کے نزدیک بیان ہی دلیل ہے، اور دلیل کی دو قسمیں ہیں : (۱) دلیل عقلی (۲) دلیل سمعی۔ دلیل سمعی کی بنیاد معجزہ ہے، جو دلیل معجزہ سے قریب تر ہوگی وہی مقدم کئے جانے کی زیادہ مستحق ہوگی، اور جو دلیل سمعی معجزہ سے جتنی دور ہوگی

اسی قدر مؤخر ہوگی، لہذا سب سے مقدم کتاب اور سنت متواترہ ہیں، اس کے بعد اجماع، اس کے بعد خبر واحد اور قیاس۔

اس کے بعد امام الحرمین نے لغوی بحثیں شروع کی ہیں اور وضاحت کی ہے کہ اہل اصول لغات کی ان ہی بحثوں پر توجہ کرتے ہیں جنھیں ائمہ عربیت نے چھوڑ رکھا ہے یعنی اوامر ونواہی، عموم وخصوص وغیرہ کی بحثیں، جن سے امام شافعیؒ نے تعرض کیا ہے۔

ان تمام بحثوں کے دوران امام الحرمین قاضی باقلانی کی بعض آراء کا ذکر کرتے رہتے ہیں، جس سے واضح انداز میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ امام شافعی کے منہج پر یہ اضافے کرنے میں قاضی باقلانی ان پر سبقت لے گئے ہیں۔

امام الحرمین امام محمد ابو حامد غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کے سب سے ممتاز استاد ہیں، لہذا امام غزالی کا اپنے شیخ سے متاثر ہونا بالکل فطری بات ہے۔ اصول فقہ میں امام غزالی کی چار کتابیں ہیں:

(۱) المنخول۔ یہ متوسط حجم کی کتاب ہے اور شائع شدہ ہے، امام غزالیؒ نے اس کتاب کو اصول فقہ کے ابتدائی یا متوسط طلبہ کے لئے تصنیف فرمایا ہے۔

(۲) تہذیب الاصول۔ امام غزالی نے المستصفی (۶۰) میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے؛ لیکن اس کتاب کے بارے میں کتاب کے نام کے علاوہ کچھ معلوم نہیں۔

(۳) شفاء الغلیل فی بیان الشبہ والمخیل ومسالک التعلیل۔ اس کتاب کو ایڈٹ کر کے ۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۰ھ میں بغداد میں شائع کر دیا گیا ہے۔

(۴) المستصفی۔ یہ کتاب اصول فقہ پر امام غزالی کی انسائیکلو پیڈیا ہے اور اس فن پر امام غزالی کی آخری تصنیف ہے، مصر وغیرہ سے بار بار چھپ چکی ہے۔ یہ کتاب غزالی نے خلوت سے نکلنے کے بعد تصنیف کی۔ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں موصوف علم منطق کی بیشتر بحثیں لائے ہیں، انھیں علم منطق کی بحثوں کا بڑا اہتمام تھا؛ چنانچہ انہوں نے حد

اوراس کی شرطوں اوراقسام کا ذکر کیا ہے۔ دلیل اوراقسام دلیل پر گفتگو کی ہے۔ پھرانہوں نے کتاب کے چاروں اقطاب پر گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ چاروں اقطاب میں انہوں نے ان تمام اصولی بحثوں کوسمیٹ لیا ہے جوامام الحرمین اورقاضی باقلانی کے یہاں پائی جاتی ہیں۔جس طرح ان کے استادامام الحرمین کی کچھ منفرد آراء ہیں جن میں انہوں نے امام شافعی اورامام اشعری کی مخالفت کی ہے اسی طرح امام غزالی کی بھی مخصوص آراء ہیں جن میں وہ امام شافعی اورامام اشعری سے منفرد ہیں۔متاخرین نے ان کی بعض انفرادی آراء کو پسند کیا ہے اوربعض پر نقد کیا ہے۔

یہ جو کچھ ذکر کیا گیا علم اصول فقہ کی ترقی وارتقاء میں علماء شافعیہ کی خدمات کے اہم گوشے تھے۔

علم اصول فقہ کی ترقی وارتقاء میں حصہ لینے والی دوسری جماعت معتزلہ کی ہے۔قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب ''العمد'' یا ''العہد'' اوراس کی شرح تصنیف کی اوراپنی بعض اصولی آراء اپنی انسائیکلوپیڈیائی کتاب ''المغنی'' میں ذکر کیں۔اس کتاب کے بعض اجزاء دستیاب ہوکرطبع ہوچکے ہیں۔اس کتاب کاستر ہواں جزانہوں نے اصولی بحثوں کے لئے مخصوص کیا ہے۔

جس طرح امام الحرمین نے باقلانی کی کتابوں کے ساتھ پورا اعتناء برتا اسی طرح ابوالحسین بصری معتزلی (متوفی ۴۳۵ھ) نے قاضی عبدالجبار کی کتابوں پر پوری توجہ کی، چنانچہ انہوں نے قاضی عبدالجبار کی کتاب ''العہد'' یا ''العمد'' کی شرح لکھی اورجب انھیں اس شرح کی طوالت کااحساس دامنگیر ہواتو ''المعتمد'' کے نام سے اس کی تلخیص تیارکی۔المعتمد طبع ہوچکی ہے اورعموماً دستیاب ہے۔اسی زمانہ میں ابواسحاق شیرازی (متوفی ۴۷۶ھ) نے ''اللمع'' اور ''التبصرہ'' لکھی۔یہ دونوں کتابیں چھپ چکی ہیں اورمتداول ہیں۔

اسی طرح قاضی ابویعلی فراء حنبلی نے اپنی اصولی کتاب ''العدۃ فی اصول الفقہ'' تصنیف کی، یہ کتاب تحقیق کے ساتھ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں سعودی عرب سے شائع ہوچکی ہے۔ابن عقیل بغدادی حنبلی نے ''الواضح فی الاصول'' تصنیف کی، اورابوالخطاب نے اپنی

مشہور اصولی کتاب ''التمہید'' لکھی۔ بعض محققین نے بالکل آخری زمانہ میں اس کتاب کی تحقیق کی، مکہ میں یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

اس زمانہ میں مالکیہ نے اصول فقہ پر جو کتابیں لکھیں وہ یہ ہیں : (۱) عیون الادلہ فی مسائل الخلاف بین فقہاء الامصار۔ اس کا ایک نسخہ فاس کی جامعۃ القرویین میں ہے (۶۱)۔ شیرازی نے اختلاف ائمہ کے موضوع پر اسے مالکیہ کی سب سے بہتر تصنیف قرار دیا ہے، ابن القصار بغدادی (متوفی ۳۹۸ھ) نے یہ کتاب تصنیف کی، (۲) مقدمۃ فی اصول الفقہ۔ یہ کتاب بھی اسی مصنف کی ہے، اس کا ایک نسخہ مکتبۃ الازہر (جامعۃ الازہر کا کتب خانہ) میں ہے۔

مسائل کی تبویب اور ترتیب کے اعتبار سے شافعیہ، حنابلہ، مالکیہ، معتزلہ کی کتابیں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں جسے متکلمین کا طرز تصنیف (طریقۃ المتکلمین) کہا جاتا ہے۔

علم اصول فقہ کی تدوین وتصنیف میں علماء احناف کا رول:

اصول فقہ کے بعض تاریخ نگاروں نے دعوی کیا ہے کہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن نے اصول فقہ پر کتابیں تصنیف کی تھیں (۶۲) لیکن یہ دعوی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکا۔

صاحب کشف الظنون (۶۳) نے شیخ علاء الدین کی کتاب ''میزان الاصول'' سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے : ''اصول فقہ، علم اصول الدین کی شاخ ہے، اس لئے یہ بات بدیہی ہے کہ اصول فقہ پر کوئی بھی تصنیف ہو وہ مصنف کے عقائد کے اثرات سے آزاد نہیں ہوگی۔ اصول فقہ میں اکثر تصنیفات معتزلہ کی ہیں جو اصول میں ہمارے مخالف تھے، یا اہل الحدیث کی ہیں جو فروع میں ہمارے مخالف تھے؛ اس لئے ان لوگوں کی تصنیفات پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے علماء احناف کی کتابیں دو طرح کی ہیں: ایک قسم ان تصنیفات کی ہے جو نہایت محکم ہیں؛ کیونکہ ان کے مصنفین اصول وفروع کے جامع تھے، مثلاً ابو منصور ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ) کی ''مأخذ الشرع'' اور ''الجدل''۔

دوسری قسم ان تصنیفات کی ہے جو تحقیق معانی اور حسن ترتیب کے اعتبار سے اعلی پایہ کی ہیں؛ کیونکہ مصنفین دلائل سمعیہ سے استخراج فروع میں ماہر تھے لیکن اصول کی باریکیوں اور عقل کے قضیوں میں مہارت نہ رکھنے کی وجہ سے بعض بحثوں میں ان کی رائے مخالفین کی رائے سے مل گئی ہے۔ پھر قسم اول کی کتابیں متروک ہوگئیں یا تو الفاظ ومعانی کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے یا ہمتوں میں کوتاہی اور سستی کی وجہ سے''۔

اس بیان میں بحث ونظر کی بڑی گنجائش ہے اگر چہ یہ ایک حنفی عالم ہی کا بیان ہے، لیکن اصول فقہ کی ترقی وارتقاء کے اندر احناف کا رول واضح کرنے کے سلسلہ میں یہ بیان حقیقت سے قریب ضرور ہے، اس لئے کہ ابومنصور ماتریدی سے پہلے کے دور میں علماء احناف کی پوری توجہ الرسالہ کے بعض مضامین کی تردید کی طرف تھی، جیسا کہ عیسی بن ابان وغیرہ نے کیا۔ اس کے بعد کے دور میں اصول فقہ پر احناف کی نمایاں تصنیفات میں سے امام کرخی (متوفی ۳۴۰ھ) کی ''اصول الکرخی'' ہے جو چند صفحات پر مشتمل ہے، اور جو ابوزید دبوسی کی کتاب ''تاسیس النظر'' کے ساتھ قاہرہ سے کئی بار چھپ چکی ہے۔

اس کے بعد جصاص رازی (متوفی ۳۷۰ھ) آئے، انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''احکام القرآن'' کے مقدمہ کے طور پر ''الفصول فی الاصول'' لکھی۔ ایک ریسرچ اسکالر نے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر اس کتاب کو ایڈٹ کیا۔ کویت میں یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

یہ مانا جاسکتا ہے کہ احناف کے یہاں اصول فقہ کی تدوین وتصنیف کا ارتقائی مرحلہ ابوزید دبوسی (متوفی ۴۳۰ھ) کے ہاتھوں شروع ہوا۔ موصوف نے اصول فقہ کے موضوع پر دو کتابیں تصنیف کیں: (۱) تقویم الادلہ، پوری کتاب یا اس کے بعض حصہ کو ایک محقق نے ایڈٹ کیا ہے، لیکن اب تک اس کی طباعت نہیں ہوسکی ہے، (۲) تاسیس النظر، ابوزید دبوسی نے متقدمین خصوصا کرخی اور جصاص کی کتب اصول سے کافی استفادہ کیا ہے؛ لیکن دبوسی نے توسیع اور تفصیل سے کام لیا ہے، اور اس جانب بھی مختصر اشارے کئے ہیں کہ احناف دوسروں کے

ساتھ کن اصولوں میں متفق ہیں اور کن میں ان کا اختلاف ہے۔

ابوزید دبوسی کے بعد فخر الاسلام بزدوی (متوفی ۴۸۲ھ) آئے، انہوں نے اصول فقہ میں اپنی مشہور کتاب ''کنز الوصول إلی معرفۃ الاصول'' تصنیف فرمائی، اس میں انہوں نے عموماً اصولی مباحث کو لیا، احناف نے اس کتاب کو بہت اہمیت دی، اس کی بہت سی شرحیں لکھیں، ان میں سب سے اہم اور بہتر شرح عبد العزیز بخاری (متوفی ۷۳۰ھ) کی ''کشف الاسرار'' ہے۔ یہ شرح آستانہ اور مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

اسی طرح شمس الائمہ سرخسی (متوفی ۴۹۳ھ) نے ''اصول السرخسی'' لکھی جو مصر سے دو جلدوں میں چھپ گئی ہے، دراصل سرخسی کی کتاب دبوسی کی کتاب ''تقویم الادلہ'' کا ترمیم شدہ نسخہ ہے۔ بزدوی اور سرخسی کی کتابوں نے حنفی علماء اصول کی توجہات اپنی طرف مبذول کر لیں، اور طویل عرصہ تک حنفی علماء اصول ان دونوں کتابوں کو مرکز توجہ بنائے رہے۔

گذشتہ بحثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں ایک مخصوص فن کے طور پر اصول فقہ کا نمو مکمل ہو چکا تھا، اس کے مباحث واضح ہو چکے تھے اور اس کے مسائل متعین و محصور ہو چکے تھے، اور اسی صدی میں علماء مذاہب کے اصول مدوّن ہو چکے تھے۔

شافعیہ یا متکلمین کا منہج اور احناف کا منہج:

دو منہج سے اصول فقہ کی تدوین مکمل ہو چکی تھی: ایک منہج شافعیہ یا متکلمین کا تھا، اس منہج کو شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اور معتزلہ نے اختیار کیا (۶۴)، اس منہج کو اکثر ''طریقۃ المتکلمین'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؛ کیونکہ اس منہج پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کے مصنفین آغاز کتاب میں کچھ کلامی بحثیں لاتے ہیں مثلاً حسن و قبح کا مسئلہ، شریعت کے آنے سے پہلے اشیاء کے احکام کا مسئلہ، منعم کی شکر گزاری کا مسئلہ، ''حاکم'' کا مسئلہ۔ طریقۂ متکلمین اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اصولی قواعد کو ثابت کرنے میں استدلالی راہ اپناتے ہیں، قواعد کو ثابت کرتے ہیں، ان کی صحت پر استدلال کرتے ہیں، مخالفین کی تردید کرتے ہیں۔ ان قواعد کے تحت آنے والی جزئیات پر

زیادہ توجہ نہیں کرتے، نہ فروع کو اصول پر منطبق کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

احناف کا منہج:

احناف نے اصول فقہ کی تدوین وتصنیف میں یہ طریقہ اپنایا ہے کہ وہ لوگ اپنے ائمہ سے منقول فروع کے تقاضوں کے مطابق اصولی قواعد ثابت کرتے ہیں۔ ان کا قاعدہ فروع سے مستنبط ہوتا ہے اور فروع کے گرد دائر رہتا ہے، اس کے برعکس نہیں ہے۔ اس منہج پر جو لوگ اصول فقہ کی تحقیق کرتے ہیں، وہ فروعات میں ائمہ مجتہدین کے جاری کئے ہوئے فتاوی کو جمع کر کے ان کا تحلیل وتجزیہ کرتے ہیں اور یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ ان ائمہ نے کچھ اصولوں کی بنیاد پر یہ فتاوی جاری کئے ہیں، تو ان ہی اصولوں کو وہ لوگ ان فتاوی کی بنیادیں ثابت کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں : ''... میں نے دیکھا کہ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلافات انھیں اصولوں پر مبنی ہیں جو بزدوی وغیرہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اصول ان کے اقوال وفتاوی سے نکالے گئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ تمام اصول کہ ''خاص خود واضح ہے اسے بیان لاحق نہیں ہوتا''، ''زیادتی نسخ ہے''، ''عام بھی خاص کی طرح قطعی ہے''، ''کثرت روایات سے ترجیح نہیں ہوتی''، ''جب رائے کا دروازہ بند ہو جائے تو غیر فقیہ کی حدیث پر عمل واجب نہیں''، ''شرط اور وصف کے مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں''، ''امر کا تقاضا یقینا وجوب ہے''، اور اس طرح کے دوسرے اصول ائمہ کے کلام سے مستخرج ہیں، امام صاحب اور صاحبین سے وہ اصول صحیح روایات سے ثابت نہیں ہیں، اور ان اصولوں کی محافظت اور فقہاء متقدمین کے اجتہادات سے ان اصولوں پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں بہ تکلف ان کے جوابات دینا (جیسا کہ بزدوی وغیرہ کرتے ہیں) ان کے مخالف اصولوں کی پاسداری اور ان کا دفاع کرنے سے بہتر نہیں ہے'' (۶۵)۔ پھر شاہ صاحب نے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔

علم اصول فقہ چھٹی صدی ہجری اور اس کے بعد کی صدیوں میں:

علم اصول فقہ کے مباحث ومسائل متکلمین کے منہج کی چار کتابوں: العہد، المعتمد، البرہان اور المستصفی میں جب سمٹ کر آ گئے تو دو جلیل القدر ائمہ متکلمین نے ان چاروں کتابوں کی تلخیص کا کام انجام دیا: (۱) امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ ھ)، جنھوں نے ''المحصول'' کے نام سے ان چاروں کتابوں کی تلخیص کی، (اس کتاب کی تحقیق کا شرف مجھے حاصل ہوا، جامعۃ الامام محمد بن سعود نے چھ ضخیم جلدوں میں یہ کتاب شائع کی۔ آج کل دوبارہ اس کی طباعت ہو رہی ہے)، (۲) امام سیف الدین آمدی (متوفی ۶۳۱ ھ)، موصوف نے ''الاحکام فی اصول الاحکام'' کے نام سے ان چاروں کتابوں کی تلخیص کی۔ ریاض اور قاہرہ وغیرہ سے یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔

یہ دونوں کتابیں اصول فقہ کی مبسوط کتابوں میں دوسری کتابوں کی بہ نسبت آسان ہیں، المحصول کی عبارت زیادہ واضح ہے، اس میں تفصیل بھی زیادہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کی بہت سی مختصرات، شرحیں اور تعلیقات لکھی گئیں۔ ''المحصول'' کی تلخیص تاج الدین ارموی (متوفی ۶۵۶ ھ) نے ''الحاصل'' کے نام سے کی۔ ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر جامعۃ الازہر میں ''الحاصل'' کی تحقیق کی جا چکی ہے، لیکن اب تک اس کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ فخر الدین رازی نے خود ''المنتخب'' کے نام سے ''المحصول'' کا اختصار کیا ہے۔ ایک ریسرچ اسکالر نے اسے بھی ایڈٹ کر دیا ہے۔ قاضی بیضاوی (متوفی ۶۸۵ ھ) نے اپنی کتاب ''منہاج الوصول إلی علم الاصول'' میں ''الحاصل'' کا اس حد تک اختصار کیا ہے کہ اس اختصار نے کتاب کو چیستان اور معمہ بنا دیا ہے، اس لئے بہت سے لوگوں نے ''منہاج الاصول'' کی شرحیں لکھی ہیں، اس کی سب سے بہتر شرح اسنوی (متوفی ۷۷۲ ھ) کی ''نہایۃ السؤل'' ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے اصول فقہ کا اشتغال رکھنے والوں نے طویل زمانہ تک استفادہ کیا، اور ازہر کے شافعی علماء آج تک اسے مرکز توجہ بنائے ہوئے ہیں۔

آمدی کی ''الإحکام'' کا اختصار ابن حاجب مالکی (متوفی ۶۴۶ھ) نے اپنی مشہور کتاب ''منتہی السؤل والأمل فی علمی الاصول والجدل'' میں کیا، متداول شرحوں میں اس کی سب سے اچھی شرح عضد الدین (متوفی ۷۵۶ھ) کی شرح ہے، اس پر حواشی اور تعلیقات بھی لکھی گئی ہیں۔

یہ سب کتابیں متکلمین کے منہج پر لکھی گئیں جن میں قواعد ثابت کئے جاتے ہیں، ان قواعد پر دلائل قائم کئے جاتے ہیں۔ ان قواعد کے مخالفین بھی اسی طرح کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک فریق سپر انداز ہو جائے۔

حنفی اصولیین بزدوی اور سرخسی کی کتابوں کے مطالعہ وتدریس میں مشغول رہے۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی کے اوائل تک یہی صورت حال رہی، یہاں تک کہ حنفی علماء اصول نے اصول فقہ کی ترتیب وتصنیف کے بارے میں ایک نیا طریقہ اپنایا، اور وہ طریقہ یہ تھا کہ متکلمین اور حنفیہ دونوں کے طریقوں کو جمع کیا جائے؛ تاکہ ایسی کتابیں تیار ہوں جو دونوں فریقوں کے اصولوں کی جامع ہوں اور دونوں طریقوں کو ہم آہنگ کریں۔

مظفر الدین ساعاتی (متوفی ۶۹۴ھ) نے اپنی کتاب ''بدیع النظام الجامع بین کتابی البزدوی والاحکام'' تصنیف فرمائی، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور متداول ہے۔ صدر الشریعہ (متوفی ۷۴۷ھ) نے ''تنقیح الاصول'' لکھی جس میں انہوں نے ''المحصول، اصول البزدوی، مختصر ابن الحاجب'' کی تلخیص پیش کی، پھر اس کتاب کی انہوں نے خود ''التوضیح'' کے نام سے شرح لکھی۔ تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) نے ''التلویح'' کے نام سے ''التوضیح'' پر حاشیہ لکھا۔ تنقیح، توضیح، تلویح تینوں طبع ہو چکی ہیں اور متداول ہیں۔ تاج الدین سبکی شافعی نے اپنی مشہور کتاب ''جمع الجوامع'' تصنیف فرمائی، اس کے مقدمہ میں سبکی نے لکھا کہ انہوں نے اصول فقہ کی سو کتابوں سے یہ کتاب تیار کی ہے۔ بہت سے لوگوں نے ''جمع الجوامع'' پر شرحیں اور تعلیقات لکھیں، اس کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ مروج شرح جلال الدین محلی کی شرح

ہے، شافعیہ کے نزدیک جلال الدین محلی کی شرح اصولی مطالعات کا بنیادی ستون ہے۔ بدر الدین زرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) نے بھی ''تشنیف المسامع'' کے نام سے ''جمع الجوامع'' کی شرح لکھی ہے، اس کتاب کا ایک حصہ شیخ مطیعی (متوفی ۱۳۵۴ھ) کی تعلیقات کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہو چکا ہے۔ جامعۃ الامام کے ایک ریسرچ اسکالر نے اس کتاب کے ایک مبحث کو ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر ایڈٹ کیا ہے۔

زرکشی نے ایک کتاب ''البحر المحیط'' بھی تصنیف کی، جس میں انہوں نے سو سے زائد کتابوں سے اہل اصول کے اقوال جمع کئے۔ ایک ریسرچ اسکالر نے میری نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر یہ کتاب ایڈٹ کی ہے۔ جلد اول کی تحقیق مکمل ہو چکی ہے اور طباعت کے لئے تیار ہے۔

ابن قدامہ حنبلی (متوفی ۶۲۰ھ) نے ''روضۃ الناظر وجنۃ المناظر'' تصنیف کی، جس میں انہوں نے امام غزالی کی ''المستصفی'' کی تلخیص کی، اور اس میں بہت سے فوائد ان قواعد کے سلسلہ میں شامل کئے جن میں حنابلہ کا دوسروں سے اختلاف ہے۔ متعدد بار یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ حنابلہ نے اس کتاب میں دلچسپی دکھائی اور اس کتاب کے ذریعہ دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو گئے۔ سلیمان طوفی (متوفی ۷۱۶ھ) نے ''روضۃ الناظر'' کا اختصار کیا، پھر اپنی ہی مختصر کی دو جلدوں میں شرح لکھی۔

امام قرافی مالکی (متوفی ۶۸۴ھ) نے ''تنقیح الفصول فی اختصار المحصول'' تصنیف کی، اسی طرح ''المحصول'' کی ضخیم شرح ''نفائس الاصول'' کے نام سے لکھی۔ ''نفائس الاصول'' کے کچھ حصے کی تحقیق میری نگرانی میں ریاض میں ہو چکی ہے۔

چھٹی فصل

اجتہاد کے مباحث

اصول فقہ کی کتابوں میں مباحث اجتہاد کے سلسلہ میں ایک مستقل باب ہوتا تھا یا چند ابواب پر مشتمل ایک کتاب، جس میں اہل اصول اجتہاد کی تعریف کرتے تھے، اجتہاد کے شرائط اور اقسام کی وضاحت کرتے تھے، اور اس مسئلہ پر بحث کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اجتہاد کرنے کے مکلف تھے یا نہیں؟ اور نبی اکرم ﷺ کے عہد میں صحابہ کرام اجتہاد کرنے کے مکلف تھے یا نہیں؟ مجتہدوں میں سے ایک ہی شخص صواب پر ہوتا ہے یا صواب کا تعدد ممکن ہے؟ کن مسائل میں اجتہاد جائز ہے اور کن میں اجتہاد جائز نہیں؟ پھر اسی اسلوب میں اہل اصول مباحثِ تقلید پر گفتگو کرتے ہیں۔

آٹھویں صدی میں ابراہیم بن موسی شاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) نے مشہور کتاب ''الموافقات'' تصنیف کی، اس کتاب میں انہوں نے اجتہاد پر اس لحاظ سے بحث کی کہ اجتہاد ایک فکری عمل ہے جو دو ستونوں پر قائم ہے :(۱) عربی زبان کے قواعد اور اسالیب تعبیر کی مکمل معرفت۔ اس کی تفصیلات شاطبیؒ نے عربی زبان وادب کے مصنفین اور اصول فقہ کے دوسرے مصنفین کے لئے چھوڑ دی ہیں۔(۲) اجتہاد کا دوسرا بنیادی ستون شاطبی کی نظر میں شرعی احکام کی مشروعیت سے شارع حکیم کے جو مقاصد ہیں ان کی معرفت ہے۔ ان مقاصد شریعت پر شاطبی سے پہلے کے مصنفین اصول فقہ نے زیادہ توجہ نہیں کی تھی بلکہ وہ لوگ ''علت'' کے اقسام پر گفتگو کرتے ہوئے ضمناً مقاصد شریعت کا تذکرہ کرتے تھے۔ اس کے برخلاف شاطبیؒ نے یہ کتاب مقاصد شریعت ہی کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے لکھی ہے، یہ موضوع بڑا نازک، غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ شارع کے احکام اور ان کے مقاصد جاننے کے لئے یہ

موضوع بہت ضروری ہے،لیکن یہ کتاب جس اہمیت ومنزلت کی مستحق تھی اسے وہ مقام نہیں مل سکا اور اصول فقہ پر تحقیق کرنے والوں نے نظر انداز کیا؛ کیونکہ اصول فقہ پر تحقیق وریسرچ کرنے والوں کے ذہنوں میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ تعلیل بالحکم (حکم منصوص کی علت نکال کر اسی پر حکم کا مدار رکھنا) جائز نہیں ہے،اس لئے کہ وہ منضبط نہیں ہے،اور جب تک یہ صورت حال رہے گی مقاصد شریعت کی بحث کرنا اکثر لوگوں کی نگاہ میں عقلی عیاشی شمار ہوگی۔ یہ کتاب مطبوع اور متداول ہے۔کاش اصول فقہ کے مدرسین یا ان کا نصاب ترتیب دینے والے حضرات اصول فقہ پر ریسرچ کرنے والے طلبہ کو ''الموافقات'' کی طرف متوجہ کریں،خصوصاً ان طلبہ کو جو قیاس،تعلیل، اجتہاد کے موضوعات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔اس دور میں شیخ ابن عاشور اور شیخ علال فاسی نے مقاصد شریعت کے موضوع پر اپنی تحریروں میں توجہ دی ہے۔

ابن ہمام (متوفی ۸۶۱ھ) نے ''التحریر'' تالیف کی، ابن ہمام کے شاگرد ابن امیر الحاج (متوفی ۸۷۹ھ) نے ''التحریر'' کی شرح ''التقریر والتحبیر'' کے نام سے لکھی، اصل کتاب اور اس کی شرح دونوں شائع ہوچکی ہیں۔''التحریر'' بھی ان کتابوں میں سے ہے جن میں حنفیہ اور متکلمین دونوں کے طریقوں کو جمع کیا گیا ہے۔''التحریر'' کی ایک دوسری شرح امیر بادشاہ کی ''تیسیر التحریر'' کے نام سے ہے، یہ بھی چھپی ہوئی ہے۔

قاضی علاء الدین مرداوی (متوفی ۸۸۵ھ) نے ''اصول ابن مفلح'' (متوفی ۷۶۳ھ)(۶۶) کا اختصار تیار کیا جس کا نام ''تحریر المنقول وتہذیب علم الاصول'' رکھا۔ایک ریسرچ اسکالر نے اسے ایڈٹ کیا ہے، جلد ہی اس کی اشاعت متوقع ہے، اسی شخص نے ''اصول ابن مفلح'' کو بھی ایڈٹ کیا ہے۔

اس کے بعد ابن النجار فتوحی حنبلی نے مرداوی کی کتاب ''تحریر المنقول'' کا ایک ''مختصر'' تیار کیا پھر اس مختصر کی بہت عمدہ شرح لکھی۔ یہ شرح اصول فقہ کی زمانہ اخیر کی کتابوں میں جامع ترین اور بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، مصر سے یہ کتاب ادھوری شائع ہوئی ہے۔ پھر دو جلیل القدر اساتذہ ڈاکٹر نزیہ حماد اور ڈاکٹر محمد الزحیلی نے اس کتاب کو ایڈٹ کیا۔

مکہ مکرمہ کی کلیۃ الشریعہ کے مرکز البحث العلمی نے اس کی طباعت کا بیڑا اٹھایا، اس کے اکثر اجزاء منظر عام پر آچکے ہیں، بقیہ اجزاء بھی زیر طبع ہیں۔

بارہویں صدی ہجری میں محب اللہ بن عبد الشکور بہاری حنفی (متوفی ۱۱۱۹ھ) نے اپنی مشہور اصولی کتاب ''مسلم الثبوت'' تصنیف کی، ''مسلم الثبوت'' متاخرین حنفیہ کی دقیق ترین اور جامع ترین کتابوں میں سے ہے۔ ''مسلم الثبوت'' علاحدہ بھی شائع ہوچکی ہے اور اپنی شرح کے ساتھ بھی ہندوستان میں چھپی ہے، اپنی مشہور شرح ''فواتح الرحموت'' کے ساتھ غزالی کے ''المستصفی'' کے حاشیہ پر بھی بار بار شائع ہوچکی ہے۔

یہ تمام کتابیں اوپر ذکر کردہ طریقوں پر لکھی گئی ہیں۔ تمام کتابوں میں اس بات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے کہ اپنے علماء کے مذاہب کو ثابت کیا جائے اور مخالف علماء کے مذاہب کا ابطال کیا جائے۔ چھٹی صدی ہجری سے لے کر اب تک ہمیں ایسی کتابیں نہیں ملتیں جن میں اصول فقہ کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہو کہ یہ مسلمان فقیہ کے لئے بحث وتحقیق کا مخصوص منہج ہے جو اس کے ذہن کو فقہی اجتہاد میں خطا سے بچاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسری اشارہ شیخ مصطفی عبد الرازق کی کتاب ''تمہید تاریخ الفلسفۃ الاسلامیۃ'' میں آیا ہے۔ شیخ مصطفی عبد الرازق کے شاگرد ڈاکٹر النشار نے اپنی کتاب ''مناہج البحث'' میں اس اشارہ کی تفصیل اور وضاحت کی کوشش کی ہے۔

تیرہویں صدی ہجری میں قاضی شوکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) نے اپنی اصولی کتاب ''ارشاد الفحول'' تصنیف کی، ضخامت میں چھوٹی ہونے کے باوجود اس کتاب میں مختلف اصولی آراء کو اچھے طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، مناسب اختصار کے ساتھ ان آراء کے دلائل بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ جن آراء کو مصنف نے راجح سمجھا ہے انھیں ترجیح بھی دی ہے۔ اصول فقہ پر تحقیق کرنے والے طلبہ کے لئے مختلف آراء کا تقابلی مطالعہ کرنے کے لئے بہترین کتاب ہے، متعدد بار یہ کتاب شائع ہوچکی ہے، نصاب درس میں شامل کئے جانے کے لائق ہے، لیکن میرے علم کی حد تک ابھی تک اسے کسی ادارہ کے نصاب درس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

نواب محمد صدیق خان (متوفی ۱۳۰۷ھ) نے ''حصول المامول من علم الاصول'' کے نام سے شوکانی کی ''ارشاد الفحول'' کی تلخیص لکھی ہے۔ یہ کتاب مختصر ہے اور شائع ہو چکی ہے۔ ''ارشاد الفحول''، زرکشی کی کتاب ''البحر المحیط'' کی دقیق تلخیص مانی جاتی ہے، اسی طرح محلاوی کی ''تسہیل الاصول'' کو ''ارشاد الفحول'' کی تلخیص و اختصار قرار دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد اصول فقہ کی تحقیقات نے دو رخ اختیار کئے:

۱۔ اصول فقہ کے مذکرات (یادداشتیں)، مداخل (فن کی ابتدائی اور بنیادی بحثیں)، ملخصات (خلاصے تیار کرنا)۔ یہ کام فقہ و اصول فقہ کے ماہر اساتذہ مختلف کالجوں کے طلبہ کے لئے اس علم کو آسان بنانے کے لئے انجام دیتے تھے؛ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ طلبہ اس علم سے بے رغبت یا اس کے پڑھنے سے عاجز ہیں۔

ان یادداشتوں اور تحقیقات نے اس علم میں کوئی اضافہ نہیں کیا، کیونکہ ان میں سے اکثر کتابوں میں اصول فقہ کے بعض مسائل کو عصری زبان میں از سر نو لکھ دیا گیا ہے۔ شیخ مرصفی، محلاوی، خضری، عبدالوہاب خلاف، شنقیطی، سایس، مصطفی عبدالخالق، ابوزہرہ، ابوالنور زہیر، معروف دوالیبی، عبدالکریم زیدان، عبدالغنی عبدالخالق، زکی الدین شعبان، محمد سلام مذکور وغیرہ کی کتابیں دراصل ان حضرات کے محاضرات (لکچرس) ہیں جو ان حضرات نے کلیات الحقوق (لا کالجز) اور کلیات الشریعہ (شریعت کالجز) کے طلبہ کے لئے تیار کئے۔

۲۔ دوسرا رخ یہ ہوا کہ ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے والے طلبہ نے اس علم کے بعض مباحث پر تحقیقی مقالے لکھے یا ذخیرۂ مخطوطات میں سے ان فن کی قدیم کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ اس رخ نے بلاشبہ اپنی دونوں شاخوں کے ذریعہ اس فن کی غیر معمولی خدمت کی، لیکن ہمارے اندازے کے مطابق یہ خدمات بلند مطلوبہ معیار سے فروتر ہیں، اس لئے یہ علم اسی مقام پر کھڑا ہے جہاں ہمارے اسلاف اسے چھٹی صدی ہجری میں چھوڑ گئے تھے۔

خلاصہ بحث اور نتائج:

جو تفصیلات پیش کی گئیں ان سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ یہ قواعد جو اصول فقہ کے نام سے معروف ہیں اصطلاحی الفاظ میں ان کا ظہور نہ زمانہ رسالت میں ہوا تھا نہ عہد صحابہ میں؛ اگرچہ ان دونوں ادوار میں جو اجتہادی اعمال ہوئے ان میں سے اکثر کو ان قواعد کے تحت داخل کیا جاسکتا ہے، ایسا اس لئے ہوا کہ وہ حضرات احکام فقہیہ جزئیہ کا استخراج ان کے تفصیلی مصادر و مآخذ سے اجتہاد کی فطری صلاحیت کے ذریعہ کرتے تھے، جس طرح وہ لوگ عربی زبان میں گفتگو فطری طور پر کرتے تھے ان نحوی قواعد کی رعایت کے بغیر جن کا فنی ظہور عہد صحابہ کے بعد ہی ہوا ہے۔

۲۔ علم اصول فقہ کے قواعد کو سب سے پہلے امام محمد بن ادریس شافعیؒ نے جمع کیا، جن کی پیدائش ۱۵۰ھ میں اور وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی۔ امام شافعیؒ کی ''الرسالہ'' علم اصول فقہ کی پہلی جامع کتاب ہے، جسے انہوں نے امام عبدالرحمن بن مہدی (۱۳۵۔۱۹۸ھ) کی فرمائش پر تصنیف کیا، اس کتاب کی تصنیف سے قبل ہی دو مشہور فقہی اسکول ''اہل الحدیث اسکول'' اور ''اہل الرائ اسکول'' قائم ہو چکے تھے۔ ''اہل الحدیث اسکول'' کے پیشوا امام مالک (۹۳۔۱۷۹ھ) تھے اور ''اہل الرائ اسکول'' کے پیشوا امام ابوحنیفہ (۷۰ھ۔۱۵۰ھ) تھے، اور ''الرسالہ'' کی تصنیف سے پہلے ہی اہل الحدیث اور اہل الرائ دونوں کی فقہ رائج ہو چکی تھی اور دونوں کے پیروؤں میں فقہی کشمکش برپا ہو چکی تھی (۶۷)۔ اس دور کے دوسرے سیاسی، کلامی، فلسفی نزاعات کی طرح یہ فقہی نزاع بھی معاشرہ میں داخل ہو چکی تھی۔

۳۔ علم اصول فقہ فقہاء کے لئے بحث کا منہج ہے (۶۸)، جس طرح علم منطق علم فلسفہ کا منہج بحث ہے (۶۹)، اسی لئے اہل اصول نے اصول فقہ کی اس طرح تعریف کی ہے کہ اصول فقہ اجمالی طور پر فقہ کے طرق (راستوں)، ان طرق سے استدلال کے ڈھنگ اور استدلال کی جانے والی دلیل کی کیفیت کے مجموعے کا نام ہے (۷۰)۔ لہذا اصول فقہ ایسا قانون کلی ہے جو

مجتہد کے ذہن کو دلائل شرعیہ سے احکام شرعیہ پر استدلال کرنے میں غلطی سے بچائے (۷۱)۔ لیکن اس طور سے اس علم کا استعمال صرف امام شافعی نے اپنی فقہ جدید میں کیا ہے۔

۴۔ یہ اہم حقیقت برابر ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے کہ امام شافعی کی فقہ جدید کے سوا پورے ذخیرہ فقہ میں صورت حال یہ رہی کہ ائمہ نے اصول فقہ پر کلام کرنے سے پہلے ہی فقہ پر بحثیں کیں؛ اس لئے امام شافعی کے علاوہ دوسرے فقہاء کے یہاں علم اصول فقہ نے قانون کلی اور منہج بحث کا رول ادا نہیں کیا؛ بلکہ فتاوی جزئیہ کے لئے جواز فراہم کرنے اور ائمہ کے اقوال وفتاوی کے حق میں استدلال وجدال کی بنیاد بننے کا رول ادا کیا۔ کیونکہ فقہاء مجتہدین کا طریقہ یہ تھا کہ یہ حضرات اصول فقہ میں جمع کردہ اصول وقواعد کو واسطہ بنائے بغیر براہ راست شریعت کے تفصیلی دلائل سے نئے واقعات اور حوادث کے احکام دریافت کرتے۔ امام ابوحنیفہؒ نے تقریباً پانچ لاکھ مسائل فقہیہ کے بارے میں فتوی دیا (۷۲)۔ ان فتاوی کو ان کے تلامذہ نے نقل کیا؛ لیکن جن اصولی قواعد سے امام صاحب نے یہ فتاوی متفرع کئے وہ ہم تک امام صاحب سے سند متصل کے ساتھ نہیں پہنچے (۷۳)، ہاں چند عبارتیں امام صاحب سے منقول ہیں جن میں انہوں نے اپنے استنباط واجتہاد کے مصادر وماخذ کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کا ایک قول یہ ہے :

''.... میں کتاب اللہ سے حکم شریعت لیتا ہوں، اس میں نہیں پاتا ہوں تو سنت رسول سے، اگر قرآن وسنت دونوں میں مسئلہ کا حکم نہیں ملا تو میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں ترک کر دیتا ہوں؛ لیکن صحابہ کرام کے اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء، سعید بن المسیب تک آپہنچتا ہے تو ان لوگوں کی طرح میں بھی اجتہاد کرتا ہوں'' (۷۴)۔

جب بعض لوگوں نے عباسی خلیفہ منصور کو امام ابوحنیفہ کے خلاف بھڑکانا چاہا تو امام صاحب نے منصور کے نام جو وضاحتی خط لکھا اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے :

''... امیر المؤمنین صورت حال وہ نہیں ہے جو آپ تک پہنچی ہے۔ میں کتاب اللہ

پر عمل کرتا ہوں، پھر سنت رسول پر عمل کرتا ہوں، پھر ابوبکر، عمر، عثمان، علی کے فیصلوں کو اختیار کرتا ہوں، اس کے بعد بقیہ صحابہ کے فیصلوں کو، اس کے بعد اگر اختلاف ہوتا ہے تو قیاس سے کام لیتا ہوں، اور اللہ تعالی اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی قرابت نہیں ہے'' (۷۵)۔

جب امام ابوحنیفہؒ پر اتہام لگایا گیا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں تو فرمایا : ''... جو لوگ ہمارے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم کرتے ہیں تو انہوں نے کذب بیانی اور افترا پردازی کی، کیا نص کے بعد بھی قیاس کی ضرورت باقی رہتی ہے؟'' (۷۶)۔

۵۔ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ دور اموی کے آغاز سے لے کر خلافت اسلامیہ کے زوال وانہدام تک امت اسلامیہ کی سلطنت وقیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہی جو اجتہاد کے اہل نہیں تھے؛ اس لئے احکام شرعیہ میں اجتہاد کا کام ایسے علماء کے ہاتھوں میں آیا جنھیں سلطنت وحکومت حاصل نہیں تھی۔ اس کلیہ سے خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیزؒ کے علاوہ کسی اور کا استثناء انتہائی دشوار ہے۔ اس صورت حال کا فقہ اور اصول فقہ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

اس کا اثر یہ پڑا کہ مسلمانوں کی عملی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کے بارے میں ان دونوں علوم کا رویہ آئیڈیل اور نظری ہو گیا (۷۷)، یعنی یہ دونوں علوم یہ بتانے لگے کہ مسلمانوں کی زندگی میں کیا ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ان کی حقیقی زندگی کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے۔

۶۔ اس علم کے مصنفین ومورخین نے علوم شرعیہ نقلیہ کے تحت اصول فقہ کو شامل کیا (۷۸)، اگرچہ بعض حضرات نے یہ صراحت کر دی کہ اس علم کے مبادی علوم عربیت اور بعض علوم شرعیہ وعقلیہ سے ماخوذ ہیں (۷۹)۔ اس علم کے ایک ممتاز ترین مصنف امام غزالیؒ نے یہاں تک لکھ دیا : ''... علوم میں سب سے اشرف وہ علم ہے جس میں عقل ونقل دونوں باہم آمیز ہوتے ہیں اور رائے وشریعت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ علم فقہ اور اصول فقہ اسی طرح کے علم ہیں؛ کیونکہ فقہ واصول فقہ صاف ستھری شریعت اور عقل سے ایک ساتھ ماخوذ ہیں، نہ ان میں محض عقلوں سے کام کیا جاتا ہے کہ شریعت اسے قبول نہ کرے، اور نہ یہ علوم محض تقلید پر مبنی

ہیں جس کی تائید وتصویب عقل نہیں کرسکتی'' (۸۰)۔

شاید امام غزالی اور دوسرے اہل اصول کے بیانات کی روشنی میں ہمیں یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ فقہ اسلامی کے ذرائع وماٰخذ تین ہیں:

(۱) وحی۔ اس میں قرآن وسنت دونوں شامل ہیں۔

(۲) عقل۔ نصوص کی تفسیر، ان کی تطبیق کی راہوں کی تلاش، جزئیات کو کلیات سے مربوط کرنے، غیر معلل احکام میں علتوں کے استنباط، غیر منصوص مسائل میں حکم لگانے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں (جن کی تحدید وتفصیل کی جاسکتی ہے) عقل کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۳) تجربات، عرف وعادت اور مصالح۔ انھیں تینوں بنیادی اقسام پر تمام فقہی اصولوں کو (خواہ متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ) تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ اصول یہ ہیں: کتاب، سنت، اجماع، قیاس، منافع میں اباحت اور مضرات میں ممانعت کا اصل ہونا، استصحابِ حال، استحسان، صحابی کا قول جبکہ صحابہ کے درمیان اس قول کی شہرت ہوئی ہو اور کسی صحابی نے اس کی مخالفت نہ کی ہو، مختلف اقوال میں سب سے اقل کو اختیار کرنا، سب سے اخف کو اختیار کرنا، استقراء ناقص، مصالح مرسلہ، عرف، حکم پر دلالت کرنے والی دلیل کے نہ ہونے سے حکم کے نہ ہونے پر استدلال کرنا، امم سابقہ کی شریعت، اور سد ذرائع۔

۷۔ تاریخ اسلام میں کچھ ایسے عوامل پائے گئے (جن کی طرف میں نے پیرا گراف (ب) میں اشارہ کیا ہے) جنہوں نے ہم پر خوف مسلط کر دیئے، اس کے نتیجہ میں بہت سی پابندیاں لگادی گئیں، ان پابندیوں کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی عقلیت اور اسلامی فکر کا رخ امور جزئیہ کی طرف مڑ گیا اور اسلامی عقلیت کلی اور جامع طرز فکر سے دور ہوتی گئی؛ حالانکہ یہ کلیت اور جامعیت اسلامی فکر کی مخصوص پہچان تھی، اس تبدیلی کا ہمارے فقہی جوابات اور بحثوں پر گہرا اثر پڑا، اور ہمارے پیش کردہ فقہی حل اور مباحث پر بھی جزئیاتی رنگ چڑھ گیا۔

۸۔ یہ بات معروف ومسلم ہے کہ ہر علم میں اور زندگی کے ہر معاملہ میں کچھ امور ایسے ہوتے ہیں جو تبدیلی قبول کرتے ہیں اور تبدیلی کے محتاج ہوتے ہیں اور ترقی وتبدیلی کے بغیر وہ

وجود میں نہیں آسکتے، اور کچھ امور نا قابل تغیر اور ثابت ودائم ہوتے ہیں، اسلامی فکر وفہم اس بات کا متقاضی ہے کہ دونوں طرح کے امور میں کامل ہم آہنگی ہو، اسی لئے اصول فقہ میں بھی کچھ قواعد ثابت ودائم اور نا قابل تغیر ہیں اور کچھ قواعد ہمیشہ تبدیلی اور تجدید چاہتے ہیں۔ یہ بات اجتہاد کے مسائل میں بالکل واضح ہے۔

اسی لئے ہم جہاں تمام اہل علم کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ خلا میں اپنا اجتہادی عمل شروع نہ کریں بلکہ امت کے پیشرو مجتہدین اور علماء کے اجتہادات سے پورا استفادہ کریں، وہیں ہم پوری قوت سے یہ بات بھی کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی خاص مجتہد کے اجتہادات کی اتباع کی فرضیت کا دعوی بھی نہیں کرسکتا۔ کسی کے اجتہاد کے بارے میں بہت سے بہت یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ: وہ ایک رائے ہے اور رائے تو مشترک ہوتی ہی ہے(۸۱)۔

۹۔ اسلاف کے مناہج کے مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اصل مقصد حکم جاننا اور فتوی صادر کرنا نہیں ہے؛ بلکہ ان کا مقصد تطبیقی شکل میں اللہ کی حکمرانی قائم کرنا ہے۔ یہ مقصد اس بات کا متقاضی ہے کہ حکم کی تطبیق کے حالات اور شرطوں کو حکم سے جدا نہ کیا جائے۔

اصول فقہ کی تجدید کے بنیادی خطوط:

جب یہ نکات واضح ہوگئے اور ہم نے چاہا کہ علوم اسلامیہ کے درمیان علم اصول فقہ کا جو صحیح مقام ہے اس پر ہم اس علم کو واپس لائیں اور اسے ادلہ شرعیہ میں بحث کرنے کا منہج ودستور بنادیں؛ تا کہ ہم ادلہ شرعیہ سے اپنے موجودہ مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرسکیں اور احکام دریافت کرسکیں، اور ہم ان تمام مسائل ومشکلات کو بھی اللہ کی حاکمیت کے دائرے میں لاسکیں تو ہمیں مندرجہ ذیل کام کرنے ہوں گے:

(۱) اس علم کے مباحث پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور فقیہ اصولی کو جن بحثوں کی ضرورت نہیں ہوتی ہے انھیں اس علم سے الگ کرنا ہوگا مثلاً یہ بحثیں :(۱) شریعت سے قبل اشیاء کا حکم (۲) منعم کی شکر گزاری کا مسئلہ (۳) شرع کی حاکمیت کے مباحث۔ حدود اور تعریفات پر

زیادہ توجہ اور تعریفات کے بحث ومناقشہ میں زیادہ مشغولیت ختم کرنی ہوگی۔ اسی طرح قرآن کی شاذ قراءتوں اور پورے قرآن کی عربیت سے متعلق اختلافی مسائل میں جو طویل بحثیں ہیں ان سے دستبردار ہونا ہوگا۔ خبر الواحد کے بارے میں جو طویل نزاعات ہیں انھیں اس طرح ختم کر دینا ہوگا کہ خبر الواحد میں اگر تصحیح کی شرطیں پوری ہوں اور اس کی صحت ثابت ہو تو اسے مقبول اور ماخذ احکام مانا جائے، اور بعض ائمہ مجتہدین نے خاص حالات کی بنا پر جو دوسری شرطیں لگائی ہیں ان سب پر نظر ثانی کی جائے، مثلاً حدیث کا قواعد عامہ کے مخالف نہ ہونا، یا غیر فقیہ سے مروی نہ ہونا، یا مخالف قیاس نہ ہونا، یا اہل مدینہ کے عمل کے مخالف نہ ہونا، یا ظاہر قرآن کے مخالف نہ ہونا، یا خبر واحد کا ایسے معاملہ کے بارے میں نہ آنا جس میں عموم بلوی ہے اور اس کا مشہور نہ ہونا، یا اس کے علاوہ دوسری شرطیں جو زمانۂ ماضی سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں کے درمیان مختلف فیہ رہی ہیں، اور علوم اسلامیہ کے طلبہ کا بڑا وقت ان پر صرف ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔

(۲) ایسا لغوی وفقہی تحقیق ومطالعہ ضروری ہے جس سے معلوم ہو کہ عہد رسالت میں اہل عرب کے تعبیر کے اسالیب کیا تھے، اور یہ اسالیب کن تبدیلیوں سے گذرے۔ اسی طرح لغت عرب کے مفردات کے معانی ومفہوم میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان پر بھی نظر رکھی جائے؛ تاکہ قرآن وسنت کے نصوص کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔

(۳) اجتہادی اصول وادلہ: قیاس، استحسان، مصلحت وغیرہ پر خاص توجہ دی جائے، ان کا تاریخی مطالعہ کیا جائے، اور ان حالات کا مطالعہ کیا جائے جن حالات میں ائمہ مجتہدین ان ادلہ کے قائل ہوئے، ان ادلہ واصول کی تحقیق ومطالعہ کے ذریعہ فقہ واصول فقہ کے موضوعات پر تحقیق وریسرچ کرنے والوں میں فقہی حس کے نمو وترقی کی کوشش کی جائے۔

(۴) یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہمارے اس دور میں مجتہد مطلق کا وجود ناممکن یا دشوار ہے، جب تک یہ صورت حال باقی ہے اس وقت تک علمی اکیڈمیاں ہی مجتہد مطلق کا بدل ہیں۔

یہ اکیڈمیاں قانون سازی کے مسائل ومشکلات میں امت مسلمہ کی ضرورتیں اسی

وقت پوری کرسکتی ہیں جب کہ ان سے منسلک ایسے ماہرین ہوں جنھیں زندگی کے مختلف میدانوں میں اختصاص حاصل ہواور جو قضیہ بھی ان کے سامنے پیش کیا جائے اس کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینے کی اہلیت رکھتے ہوں، اسی کے ساتھ انھیں شریعت اسلامیہ کے قواعد واصول عامہ کی پوری واقفیت بھی ہو، اکیڈمی کے ممبران میں بلند پایہ فقہاء بھی ہوں جنھیں علوم شرعیہ اورادلہ تفصیلیہ پر پورا عبور ہو، اور شاید اسی بات کی طرف بعض فقہاء کے اس طرز عمل میں اشارہ ہے کہ ان سے ایک مریض نے رمضان میں روزہ توڑنے کے بارے میں مسئلہ معلوم کیا تو انہوں نے فرمایا: ایک مسلمان عادل طبیب سے فتوی پوچھو، اگر وہ فتوی دیدے کہ روزے تمہارے لئے مضر ہیں تو روزہ توڑنا جائز ہوگا۔

(۵) یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ علوم شرعیہ کو آسان کیا جائے، اور دوسرے علوم عصریہ کے ماہرین کو جس قدر علوم شرعیہ کی ضرورت ہے اس کی تدریس وتحقیق کو انتہائی آسان بنایا جائے۔

(۶) ہم لوگوں کو صحابہ وتابعین کی فقہ اور جن قواعد سے انہوں نے مسائل کا استنباط کیا تھا ان قواعد کے جاننے کی شدید ضرورت ہے، خصوصاً خلفاء راشدین اور ان کے معاصر اہل فتاوی صحابہ وکبار تابعین کی فقہ سے مکمل واقفیت کی حد درجہ ضرورت ہے؛ تاکہ یہ بحثیں اور تحقیقات ان لوگوں کے پیش نظر رہیں جن سے عہد حاضر کے اسلامی معاشرے کی قانونی ضروریات کی تکمیل مطلوب ہے۔

(۷) مقاصد شریعت سے واقفیت کا اہتمام کرنا، مقاصد شریعت پر تحقیقات کو ترقی دینا اور اس کے بارے میں قواعد وضوابط وضع کرنا۔

اللہ تعالی ہی توفیق دینے والا ہے۔

حواشی:

(۱) فخر الدین رازی، المحصول فی علوم اصول الفقہ ۱/ ۹۴، تحقیق: طہ جابر علوانی، ریاض، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، طبع اول، ۱۹۷۹ء/ ۱۳۹۹ھ۔

(۲) مذکرۃ اساتذۃ کلیۃ الشریعۃ فی الأزہر لسنۃ ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۳ء، فی أصول الفقہ، ص ۲۲۔

(۳) یہاں چند دوسرے مباحث بھی ہیں، اور وہ ہیں: تعلیل نصوص، حکم، مصادر احکام شریعت (القرآن)۔

(۴) دیکھئے: الأحکام للترمذی ۱/ ۸۲، ارشاد الفحول للشوکانی، ص: ۲۶۔

(۵) دیکھئے: الأحکام للترمذی ۱/ ۸۷۔

(۶) اس حدیث کی روایت دارمی نے اپنی سنن میں عطاء عن سعید عن ابن عباس کی سند سے کیا ہے ۱/ ۶۳، حدیث نمبر: ۱۲۰، ہیثمی مجمع الزوائد (۱/ ۱۵۸) میں کہتے ہیں: طبرانی نے الکبیر میں اس کی روایت کی ہے، جس میں عطاء بن سائب ہیں جو ثقہ ہیں لیکن گڈمڈ کرتے ہیں، جبکہ اس کے بقیہ رجال ثقہ ہیں۔

(۷) سنن الدارمی ۱/ ۶۲، حدیث نمبر: ۱۲۱۔

(۸) سنن الدارمی ۱/ ۶۲، حدیث نمبر: ۱۱۸۔

(۹) سنن الدارمی ۱/ ۶۳، حدیث نمبر: ۱۲۶۔

(۱۰) سنن الدارمی ۱/ ۶۳، حدیث نمبر: ۱۲۷۔

(۱۱) شیخ علی عبد الرزاق، تمہید لتاریخ الفلسفۃ، ص ۱۵۲، قاہرہ، مجاز القرآن لأبی عبیدہ (۱/ ۸) میں عبارت اس طرح آئی ہے: اسلاف کو اور نہ صحابہ کو نبی ﷺ سے قرآن کے معانی پوچھنے کی ضرورت پڑی، اس لئے کہ وہ عربی زبان والے تھے، لہذا عربی زبان والے ہونے کی وجہ سے وہ اس کے معانی پوچھنے اور اسی طرح کلام عرب میں جو فن وجوہ وفن تلخیص ہے اس کے بارے میں پوچھنے سے بے نیاز تھے۔

(۱۲) شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۲۸۹، مطبوعہ مصر، تلخیص: سید سابق۔

(۱۳) اس حدیث کی روایت امام احمد نے اپنی مسند (۵/ ۲۳۰) میں، ابوداؤد نے اپنی سنن، کتاب الاقضیہ، باب اجتہاد الرأی فی القضاء (۳/ ۳۰۳)، حدیث نمبر: ۳۵۹۲، ۳۵۹۳ میں، ترمذی نے اپنی سنن، کتاب الاحکام، باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی (۳/ ۶۱۶)، حدیث نمبر:

۱۳۲۷، ۱۳۲۸، میں اصحاب معاذ سے اور انہوں نے حضرت معاذؓ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔
امام ترمذی کہتے ہیں: اس حدیث کو ہم اسی طریق سے جانتے ہیں، اس کی سند میرے نزدیک متصل نہیں ہے، اور البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، دیکھئے: ضعیف سنن ابی داؤد، ص: ۳۵۵، ضعیف سنن ترمذی، ص: ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں: یہ حدیث اگرچہ غیر متعین لوگوں سے مروی ہے اور وہ اصحاب معاذ ہیں، لہذا اس کی وجہ سے اسے ضرر لاحق نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ حدیث کی شہرت پر دلالت کرتا ہے، دیکھئے: اعلام الموقعین (۱/ ۱۷۵)۔ اس حدیث، اس سے استدلال اور اس سے جہالت کو دور کرنے سے متعلق مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: الاجتہاد والتقلید فی الاسلام: طہ جابر علوانی، ص: ۲۳۔ ۲۴، طبع اول، دار الانصار قاہرہ، اسی طرح دیکھئے: المحصول میں اجتہاد کے مباحث۔

(۱۴) دیکھئے: اعلام الموقعین ۱/ ۱۱۱، طبع دار الحدیث۔

(۱۵) ملاحظہ ہو: الرسالۃ للشافعی، ص ۴۷۶۔

(۱۶) حضرت ابوبکرؓ سے مروی یہ کلام مجھے نہیں ملا، بلکہ میں نے پایا یہ کہ کلام حضرت عمر بن خطابؓ کا ہے، جس کی روایت ابوداؤد نے اپنی سنن، کتاب الاقضیہ، باب فی قضاء القاضی إذا أخطأ (۳/ ۲)، حدیث نمبر: ۳۵۸۶ میں، بیہقی نے السنن الکبری (۱۰/ ۱۱۷) میں کی ہے۔ ان دونوں نے ابن وہب عن یونس بن یزید عن ابن شہاب عن عمرؓ کے واسطہ سے ان الفاظ کے ساتھ کی ہے: یا أیھا الناس إن الرأی إنما کان ..... الخ۔ البانی کہتے ہیں: یہ حدیث ضعیف مقطوع ہے (ضعیف سنن ابی داؤد، ص: ۳۵۴)۔

(۱۷) اس حدیث کی روایت بخاری و مسلم نے عبد اللہ اور ابوموسی اشعریؓ کے واسطہ سے کی ہے، دیکھئے: صحیح البخاری مع الفتح، کتاب التیمّم، باب التیمّم ضربۃ ۱/ ۵۴۳، حدیث نمبر: ۳۴۷، صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب التیمّم ۱/ ۲۸۰، حدیث نمبر: ۳۶۸۔

(۱۸) اس حدیث کی اصل صحیحین میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی حدیث ہے، دیکھئے: صحیح البخاری مع الفتح، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب أجر الحاکم إذا اجتہد وأصاب أو خطأ ۱۳/ ۳۳۰، حدیث نمبر: ۷۳۵۲، صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، باب بیان أجر الحاکم إذا اجتہد وأصاب أو أخطأ ۳/ ۱۳۴۲، حدیث نمبر: ۱۷۱۶۔

(۱۹) ملاحظہ ہو: الاحکام لابن حزم ۵/ ۹۲۔ ۹۳۔

(۲۰) ملاحظہ ہو: اعلام الموقعین ۱/ ۵۱۔

(۲۱) اس کی روایت عبدالرزاق نے اپنی مصنف (۱۰/ ۳۰۴)، حدیث نمبر: ۱۹۱۹۱ میں، ابن ابی شیبہ نے المصنف (۱۱/ ۴۱۵۔۴۱۶)، حدیث نمبر: ۱۱۶۴۶ میں، دارمی نے اپنی سنن (۲/ ۴۶۲)، حدیث نمبر: ۲۹۷۲ میں، ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر (۸/ ۵۳۔ ۵۴) میں، تحقیق: احمد شاکر، بیہقی نے السنن الکبری (۶/ ۲۲۴) میں روایت کی ہے، تمام لوگوں نے عاصم عن الشعبی کے واسطہ سے روایت کی ہے۔

(۲۲) اس حدیث کی روایت بخاری ومسلم نے اپنی سندوں کے واسطہ سے حضرت ابوہریرہؓ سے کی ہے، صحیح البخاری مع الفتح، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ (۳/ ۳۰۸)، حدیث نمبر: ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ (۱/ ۵۱۔ ۵۲)، حدیث نمبر: ۲۰۔۲۱۔

(۲۳) اس کی روایت سعید بن منصور نے اپنی سنن (۱/ ۵۵)، حدیث نمبر: ۸۲ میں، بیہقی نے السنن الکبری (۶/ ۲۳۵) میں یحییٰ بن سعید عن القاسم بن محمد کے واسطے سے اسی طرح کی ہے، نیز دیکھئے: اعلام الموقعین ۱/ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔

(۲۴) دیکھئے: اعلام الموقعین ۱/ ۱۸۲۔

(۲۵) ملاحظہ ہو: اعلام الموقعین۔

(۲۶) اس کی روایت دارمی نے اپنی سنن (۱/ ۱۱۲)، حدیث نمبر: ۳۵۵ میں کی ہے، اور کہا: أخبرنا محمد بن حمید، حدثنا مہران، حدثنا أبوسنان عن أبی إسحاق عن عمرو بن میمون، عمرو بن میمون کہتے ہیں: حضرت عمر کے ساتھ علم کے دو تہائی حصہ چلا گیا، پھر انہوں نے ابراہیم سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا: حضرت عمر کے ساتھ دس میں سے نو حصے علم کے چلے گئے۔

(۲۷) حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۳۷۸۔

(۲۸) اس کی اصل صحیح مسلم، کتاب المسافرین وقصرھا، باب قصر الصلاۃ بمنی (۱/ ۴۸۲)، حدیث نمبر: ۶۹۴ میں ہے۔

(۲۹) اس حدیث کی روایت امام احمد نے اپنی مسند تحقیق شدہ (۱/ ۱۱۱)، حدیث نمبر: ۸۸۲ میں سماک عن حنش کے واسطہ سے حضرت علیؓ سے مطول کیا ہے، علامہ احمد شاکر نے اس کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔ حاکم نے اس کی روایت مستدرک (۳/ ۱۳۵) میں اعمش عن عمرو بن مرّۃ عن أبی البختری کے واسطہ سے اسی طرح مطول کیا ہے، اور حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے لیکن اسے انہوں نے روایت نہیں کی ہے، ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

(۳۰) اس حدیث کی روایت ابن سعد نے طبقات (۲/ ۳۳۸) میں کی ہے، اور لکھتے ہیں : ''أخبرنا أحمد بن عبداللہ بن یونس، أخبرنا أبوبکر بن عیاش عن نصیر عن سلیمان الأحمس عن أبیہ عن علیؓ ، اس کے اخیر میں ''لساناً ناطقاً'' کے بدلے ''لساناً طلقاً'' ہے۔

(۳۱) دیکھئے: اعلام الموقعین ۱/ ۱۸۷۔

(۳۲) اس حدیث کی روایت مسلم نے اپنی صحیح (مقدمہ) میں کی ہے، ۱/ ۱۲۔ ۱۳۔

(۳۳) ملاحظہ ہو: تہذیب التہذیب ۴/ ۲۲۲۔

(۳۴) تہذیب التہذیب ۱/ ۳۳۰۔

(۳۵) تہذیب التہذیب ۵/ ۱۳۹۔

(۳۶) تہذیب التہذیب ۵/ ۷۱۔ ۷۲۔

(۳۷) دیکھئے: الاصابۃ لابن حجر ۴/ ۱۱۲، اور اس کا حاشیہ الاستیعاب، ص: ۴۱۵۔

(۳۸) جامع بیان العلم ۱/ ۳۳۔

(۳۹) خطط المقریزی ۴/ ۱۴۳۔

(۴۰) بخاری نے یہ حدیث تعلیقاً ذکر کی ہے، اور اس کی روایت امام مالک نے الموطأ میں کی ہے، دیکھئے: شرح الزرقانی ۱/ ۱۰، حافظ ابن حجر نے اس روایت کا ذکر تغلیق التعلیق (۲/ ۸۸۔ ۸۹۹ میں عبدالعزیز بن مسلم عن عبداللہ بن دینار کے واسطہ سے اسی طرح کیا ہے، اور یحییٰ بن سعید عن عبداللہ بن دینار کے واسطہ سے بھی کیا ہے۔

(۴۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۲۰۵، ۳۰۸، تھوڑے تصرف کے ساتھ۔

(۴۲) الانتقاء لابن عبدالبر، ص: ۲۳۔

(۴۳) الانتقاء، ص: ۲۴۔

(۴۴) تاریخ بغداد للخطیب ۲/ ۶۸۔ ۶۹۔

(۴۵) الانتقاء، ص: ۸۶۔

(۴۶) حوالہ سابق۔

(۴۷) دیکھئے: مناقب الشافعی للفخر الرازی، ص: ۲۶۔

(۴۸) مغیث الخلق لامام الحرمین الجوینی۔

(۴۹) البحر المحیط للزرکشی (مخطوط)۔

(۵۰) الانتقاء، ص: ۲۵۔

(۵۱) اس اتفاق سے بعض مذاہب کے صرف چند متعصبین ہی الگ ہوئے ہیں جن کے پاس اپنی رائے کے لئے کوئی علمی دلیل نہیں ہے کہ امام شافعی سے پہلے بھی علم اصول فقہ پر کوئی کتاب لکھی گئی ہے۔

(۵۲) تمہید فی تاریخ الفلسفۃ، ص: ۲۳۴۔

(۵۳) اعلام الموقعین ۱/ ۳۲۔

(۵۴) محمد فؤاد سیزگین تاریخ التراث العربی (۲/ ۲۲۸۔۲۲۹) میں داؤد ظاہری کے آثار سے متعلق لکھتے ہیں: ابن الندیم نے داؤد ظاہری کے تقریباً ۱۵۷ کتابوں کے نام ذکر کئے ہیں، جبکہ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔
ان کتابوں کے نام جن کا ذکر مصنف نے کیا ہے وہ الفہرست لابن الندیم میں مذکور ہیں، دیکھئے: الفہرست، ص: ۲۷۲۔

(۵۵) دیکھئے: الفہرست لابن الندیم، ص: ۲۵۸۔۲۵۹۔

(۵۶) الفہرست، ص: ۲۹۹۔

(۵۷) دیکھئے: تمہید فی تاریخ الفلسفۃ۔

(۵۸) جیسا کہ نفائس القرافی میں متعدد جگہوں میں یہ لقب دیا گیا ہے (۱/ ۱۹۔۱)۔

(۵۹) ''البرہان'' کو ایڈٹ کر کے قطر سے بڑا ہی نفیس ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

(۶۰) ملاحظہ ہو: ۱/ ۱۸۷۔

(۶۱) دیکھئے: بروکلمان (ضمیمہ) ۲/ ۹۶۳، نمبر: ۴۹۔

(۶۲) ملاحظہ ہو: مناقب المکی ۲/ ۲۴۵، مقدمہ اصول السرخسی ۱/ ۳، مفتاح السعادۃ ۲/ ۳۷، الفہرست لابن الندیم، جن لوگوں نے بھی یہ دعوی کیا ہے انہوں نے دلیل میں الفہرست کی اس عبارت کو سند بنایا ہے جو ابن الندیم نے محمد بن الحسن کے حالات میں لکھی ہے'': ''وإن له في الأصول كتاب الصلاة، والزكاة، والحج''، اور یہ واضح کیا ہے کہ وہ اس سے مراد اصول دین لیتے ہیں۔

(۶۳) ملاحظہ ہو: ۱/ ۱۱۰۔۱۱۱۔

(۶۴) ان میں سے ہر گروہ کے علماء اپنی کتابوں میں ان اصولوں کا اضافہ کرتے تھے جن میں وہ دوسروں سے منفرد ہیں، اور اپنے قواعد کے مخالف قواعد کو اسی استدلالی اسلوب میں بیان کرتے تھے جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔

(۶۵) ملاحظہ ہو: حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۳۳۶۔۳۴۱، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص ۳۸۔۴۰، طبع السّلفیہ۔

(۶۶) ایک ریسرچ اسکالر نے جامعۃ الامام میں اس کے ایک حصہ کو ایم اے کے مقالے کے طور پر ایڈٹ کیا ہے، اور ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے لئے بقیہ کتاب ایڈٹ کر رہا ہے۔

(۶۷) ملاحظہ ہو: مقدمہ ابن خلدون ۳/ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴، طبع وافی۔

(۶۸) ملاحظہ ہو: ڈاکٹر نشار کی مناہج البحث، ص ۵۵۔

(۶۹) ملاحظہ ہو: مسلم الثبوت اور اس کی شرح المستصفی کے حاشیہ پر ۱/ ۹۔ ۱۰، اس کے مصنف نے منطق کی اس حیثیت کی نفی کی ہے اور ان کا گمان ہے کہ منطق کی نسبت فلسفہ اور اصول فقہ سے برابر ہے، شاید وہ اس شخص کے قول سے متاثر ہو گئے ہیں جس نے یہ کہا کہ منطق علوم کو پرکھنے کا ذریعہ ہے۔

(۷۰) المحصول، جلد اول، قسم اول۔

(۷۱) ملاحظہ ہو: رازی کی مناقب الشافعی، ص ۹۸، اور اس کے بعد کے صفحات، نشار کی مناہج البحث، ص ۵۵۔

(۷۲) ملاحظہ ہو: مصطفی عبدالرزاق کی کتاب الامام الشافعی، ص ۴۵۔

(۷۳) ملاحظہ ہو: دہلوی کی الانصاف اور ابوزہرہ کی ابوحنیفہ، ص ۲۲۳، اور اس کے بعد کے صفحات۔

(۷۴) ملاحظہ ہو: تاریخ بغداد ۳/ ۳۶۸، الانتقاء، ص ۱۴۲، مشائخ بلخ من الحنفیہ، ص ۱۹۰۔

(۷۵) ملاحظہ ہو: المیزان ۱/ ۵۲، الطبقات السنیہ ۱/ ۱۴۳، مشائخ بلخ من الحنفیہ، ص ۱۹۳۔

(۷۶) سابقہ حوالہ جات۔

(۷۷) ملاحظہ ہو: محمد یوسف موسی کی تاریخ الفقہ، ص ۱۶۰۔

(۷۸) ملاحظہ ہو: خوارزمی کی مفاتیح العلوم، ص ۶۔ ۸، المقدمہ ۳/ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۸، ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۶۔

(۷۹) ملاحظہ ہو: مفتاح السعادۃ۔

(۸۰) ملاحظہ ہو: غزالی کی المستصفی ۱/ ۱۰۳، المستصفی کے علاوہ غزالی کی اصول فقہ میں یہ کتابیں ہیں: المنخول، شفاء الغلیل فی بیان الشبہ والمخیل ومسالک التعلیل، تہذیب الاصول، یہ سب کی سب اصول فقہ کی اہم کتابوں میں سے ہیں۔

(۸۱) سیدنا عمر فاروقؓ کا کلام ہے۔

☆ ☆ ☆